سید عطاء اللہ شاہ بخاری
رش کاشمیری
مطبوعات چٹان - لاہور

سید
عطا اللہ شاہ
بخاری

| | |
|---|---|
| اشاعت اول | اکتوبر ۱۹۵۶ |
| اشاعت ثانی | مارچ ۱۹۶۰ |

مطبوعات چٹان لاہور

●

طباعت :- چٹان پرنٹنگ پریس و اردو پریس لاہور -

●

قیمت:- دو روپے چار آنے

★

شورش کاشمیری

★

# سید عطاء اللہ شاہ بخاری

●

ہم بادشاہوں کی صحبت اختیار کریں تو عزت نفس مرتی ہے۔ تاجروں میں بیٹھیں تو دل کے غریب ہو جائیں گے ـــــــ ہمارے ہم نشین کتابیں اور صرف کتابیں ہیں جن سے کسی فتنے اور کسی بدمزگی کا اندیشہ نہیں اور نہ انکی زبان اور ہاتھ سے کوئی خطرہ ہے۔

ـــــــ ابوالعباس

میں نے قبر سے زیادہ واعظ، کتاب سے زیادہ مخلص دوست اور تنہائی سے زیادہ بے ضرر ساتھی کوئی نہیں دیکھا۔

ـــــــ عبداللہ بن عبدالعزیز

۱۳ اپریل ۱۹۵۷ء جمعۃ المبارک، پہلا روزہ، اور سحری کا وقت تھا۔ میں نے سحری کھا کے ابھی کتابت کا آغاز کیا۔ ابھی پہلا فقرہ ہی لکھ پایا تھا کہ بیوی نے مجھ سے کہا: ابوجیا (میرے والد) کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ میں دوڑ کر اُن کے کمرے میں گیا تو اُنھیں مضطرب الحال پایا۔ ڈاکٹروں کی ہدایت پر گنگا رام ہسپتال میں داخل کر دیے گئے۔

دوسرے دن اُن کا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا۔ ٹھیک افطار کے وقت اُنھوں نے باسمہٖ ربی کلام سے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور ہمیشہ کے لیے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون —— موت سے کسی کو بھی مفر نہیں، ہم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، لیکن بعض سانحے ایسے ہوتے ہیں جن کا داغ ہمیشہ کے لیے رہ جاتا ہے۔ باپ کی موت نے دل و دماغ کی سب ہی خوشیوں کو آزردہ کر دیا۔ اسی آزردگی میں یہ کتاب مکمل ہوئی ہے —— اس میں کسی پہلو سے کوئی خوبی ہو تو، قارئین سے التماس ہے کہ وہ میرے والد مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔
—— اسی آزردگی کے ساتھ میں ان اوراقِ پریشاں کو والد مرحوم میاں غلام الدین احمد (علیہ الرحمۃ) سے منسوب کرتا ہوں —— کہ

اب اُن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

شورش کاشمیری

●

یہاں اُمرا دوزخ کے کتّے اور سیاستدان کھٹی
قسے ھیں اُن کے ساتھ نٹ اور اُن کے پیچھے
لاشیں چلتی ھیں اُن کی واحد خوبی یہ ھے
کہ ھر نیکی اور ھر برائی کی زبان میں جھوٹ
بول لیتے ھیں۔

-- ——زرتشت

●

حکایت از قدِ آں یارِ دل نواز کُنیم
بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کُنیم

---

# شروع کی بات

اس کتاب کے لکھنے کا خیال فسادات پنجاب کی انکوائری کمیٹی کے اجلاسوں سے پیدا ہُوا۔ جب رپورٹ چھپی تو یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس کی دو وجہیں تھیں:

اوّلاً ان لوگوں کا طرزِ عمل جو بزعم خود علما کے استخفاف سے خوش ہو کر قہقہوں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

ثانیاً پولیس افسروں کی یادداشتوں کا وہ حصّہ جس میں شاہ جی کی ذات کو زیر بحث لایا گیا تھا

مَیں نے "چٹان" میں علما کی اہانت کے خلاف اسی وقت احتجاج کیا تھا۔ باوجودیکہ مَیں نے اپنی سیاسی زندگی کے بہت سے لیل و نہار داعیانِ شریعت کی ہمراہی میں بسر کیے ہیں لیکن نہ تو میرا نقطۂ نگاہ ان سے موافق رہا نہ مَیں نے حیاتِ مُستعار کے پیراہن ہی میں منبر و محراب کا کوئی پیوند قبول کیا اور نہ شرعی برہمنوں کو مافوق البشر سمجھا —— مجھے شکایت یہ تھی کہ بغیر امتیاز

علما کے خلاف جو باتیں کہی جاتی ہیں ان کی غایت اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے جو ظاہراً بیان کی جاتی ہے۔ کس گروہ میں کالی بھیڑیں نہیں؟ کیا ارباب سیاست کی جماعت اس سے خالی ہے؟ لیکن گالی دینے کے لیے ہمیشہ علما ہی کو نشانے پر رکھا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ سیاسی سازش سے بعض مقدس الفاظ تک ذلیل کیے گئے ہیں، مثلاً یارِ غار، خلیفہ، مُلّا، زید، بکر، عُمر۔

—— اس سازش سے جس بدگوئی کا سُراغ ملتا ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان کا استعمال روزمرہ ہو گیا ہے۔

—— مُلّا کے خلاف طعن و تشنیع کی گرم بازاری بے شبہ سیاسی وجوہ سے ہے بعض شب کور نقادوں نے اپنی نفسی کوتاہیوں کا جواز پیدا کرنے کے لیے نہ صرف مُلّا کو ہدفِ تنقید بنایا بلکہ اس کی آڑ میں اُن صلحائے اُمّت کو بھی رگیدا ہے جن کا تنہا قصور یہ رہا ہے کہ وہ انگریزی حکومت اور اُس کی بیوروکریسی کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ جن علما نے تحقیر المسلمین میں ظالمانہ حصہ لیا ان کے خلاف سیاست دانوں میں کبھی مزاحمت یا مدافعت کی کوئی آواز نہیں اٹھی مگر جن علما نے قربانی و ایثار کی زندگی بسر کی یا یورپی دانشوروں کی اس کھیپ کو اس کے اعمال و افعال پر ٹوکا، ان کے خلاف سبّ وشتم کے بازار ہمیشہ ہی گرم رہے ہیں۔

—— شاہ جی کے خلاف سرکاری یادداشتوں کی حیثیت زیادہ سے زیادہ کھوکھلے قہقہوں کی ہے لیکن ان میں جو سِرِّ اندر ہے اس کا تقاضا تھا کہ اصل حقیقت بے نقاب ہو میرا خیال تھا کہ احرار دوست اہل قلم جنھوں نے شاہ جی کی رفاقت میں عُمر کا بڑا حصہ بسر کیا ہے اس فرض سے عہدہ براہوں گے لیکن چاروں طرف طویل سناٹا چھایا رہا۔

ادھر میں "پسِ دیوارِ زنداں" لکھنے میں مشغول تھا بعض دوستوں نے مجبور کیا کہ جوابی تصریحات

لکھوں لیکن اوّلاً رپورٹ کا محاسبہ میرے بس کا روگ نہ تھا - ثانیاً تحریک کے پس منظر میں جو گُل کھلے تھے ان کے پیشِ نظر میرا کچھ لکھنے سے کچھ نہ کہنا زیادہ مناسب تھا - بہرحال میں نے شاہ جی کی سوانح عمری لکھنے کا قصد کیا - اب جو حالات فراہم کرنے شروع کیے تو سب سے بڑی رکاوٹ خود شاہ جی تھے یا بعض ایسے دوست جن سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا لیکن وہ تعاون کے لیے آمادہ نہ تھے - اسی اثنا میں بعض ناشُدنی باتیں بھی مجھ تک پہنچیں - میں نے ارادہ توڑ ڈالا اور قلم کی انھی صحبتوں میں واپس چلا گیا جہاں زندگی گزارنے کے لیے تو ہے پر لکھنے کے لیے نہیں ...

—— ایکا ایکی پھر اس قسم کے تقاضے سامنے آگئے کہ دوستوں کی رضا کے آگے جھکنا پڑا - میں اس ساری کتاب کو محض "نفسیاتی مطالعہ" تک محدود رکھنا چاہتا تھا ، مگر جس شخصیت کے یہ سوانح ہیں ، اس کا گردوپیش اسے قبول نہ کرتا ، بہرکیف جس طرز پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا - فی الجملہ یہ کوئی مکمل سوانح عمری نہیں ، کچھ خاکے اور کچھ عکس ہیں - خاندانی حالات "سَوَاطِعُ الالہام" کے اشارات سے فراہم کیے گئے ہیں - میں چاہتا تھا شاہ جی کم سے کم اس حصہ ہی کو سُن کر تصحیح فرما دیتے لیکن انھوں نے گوارا نہ کیا اور میں نے بھی اصرار مناسب نہ سمجھا —— ع

اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

اس میں یا دوسرے کسی حصہ میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہو تو مجھے اس کی تصحیح و اصلاح میں خوشی ہوگی - میں نے جو کچھ لکھا ہے اُلٹے جذبے سے لکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ تحریر کا دامن کسی آلودگی سے داغدار نہ ہو - میں نے الفاظ کے چناؤ میں پورے غور و فکر سے کام لیا ، اور بار بار قطع و برید کی ہے اس پر بھی اگر کوئی لفظ قلم سے ایسا نکل گیا ہو جو نفسِ مضمون کی ثقاہت کے خلاف ہو تو مجھے اہلِ ذوق سے عفو خواہی میں تامّل نہیں ہوگا —— البتہ سی آئی ڈی کی

یادداشتوں کے بارے میں دو چار فقرے عام اسلوب سے مختلف نظر آئیں تو اس کی وجہ
ان یادداشتوں کا لب و لہجہ ہے جن کی تلخی اور سختی بیوروکریسی کے دفتر کی تو ایک ڈاڈیر فصل
ہو سکتی ہے لیکن سیاسی شرافت میں اس لب و لہجہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نطشے کہتا ہے:

"میں ان بھیانک چہروں سے خوف کھاتا ہوں، جو

صبح کے اجالوں پر اپنی کھوکھلی ہنسی پھینکتے ہیں۔"

ناشکر گزاری ہوگی، اگر میں مولانا تاج محمود لائل پوری کے ان مخلصانہ تقاضوں کا اعتراف
نہ کروں جن کی شدت کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے محاسن انھی کی مساعی
مشکور کا ثمرہ ہیں اور جو قبائح آپ دیکھ رہے ہیں وہ تمام تر میرے قلم کی درماندگیاں ہیں۔ اس کام
میں ایک اور مخلص لیکن دور افتادہ عزیز دوست رازی پاکستانی بھی مولانا تاج محمود کے ہم زبان
تھے میں ان کا بھی ممنون ہوں۔ ان کے علاوہ مولانا محمد علی جالندھری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی،
حضرت مجاہد الحسینی، سید انور حسین شاہ زیدی، برادرم سید وکیل شاہ، ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ اور
مرزا غلام نبی جانباز بھی سپاس و تشکر کے حقدار ہیں کہ راقم الحروف نے ان سے حسب دل خواہ استفادہ
کیا ہے ------

ہمیں عشق است، بر خود چیدہ چندیں داستان ورنہ
کسے از معنیٔ یک حرف صد دفتر نمی سازد

شورش کاشمیری

لاہور
۱۱ ستمبر ۱۹۵۶ء

# ایک کہانی --- ایک تاریخ

شاہ جی ان لوگوں میں سے ہیں جن کی زندگی ماضی میں بسر ہوتی ہے اور جو ایک خاص اسلوبِ زندگی کے باوصف مجموعۂ اضداد ہوتے ہیں ان شخصیتوں کا صحیح تاثر اُن کے قرب ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

شاہ جی کے چہرے مہرے سے عنانِ خیال معاً اُن یونانی فلسفیوں کی طرف مڑتی ہے جن سے فکر و نظر کی بہت سی راہیں صدیوں کی کھینچا تانی کے باوجود روشن ہیں اور جن کے تصویری پیرا ہن ان شہ دماغوں کی یاد دلاتے ہیں جن کی صورتوں سے ایک دلآویز طنطنے کا اظہار ہوتا ہے شاہ جی کا نک سک قرونِ وسطیٰ کے ان حکما و فقہا اور علما و خطبا سے مشابہ ہے جو طلوعِ تاریخ سے پہلے یونان و روما میں اور طلوعِ تاریخ کے بعد بغداد و دہلی میں پائے جاتے تھے۔

سوال مماثلت کا نہیں فرقِ مراتب بھی ظاہر ہے لیکن ایک عجیب اتفاق ہے کہ بعض داعی شخصیتیں آپس میں ایک گونہ مماثلت ضرور رکھتی ہیں۔ مثلاً، فیثا غورث، کارل مارکس، رابندر ناتھ

ٹیگور اور شاہ جی میں فکر و نظر یا علم و عمل کی کوئی راہ بھی مشترک نہیں لیکن سنگ تراش کا ایک ایسا بانکپن ضرور ہے جس سے ان کے عمومی خد و خال ہر صفاتی بعد کے باوجود ایک سے ہیں۔

ان بڑوں کی زندگی ایک خاص چال رکھتی ہے جس سانچے میں بھی ڈھلیں ہمیشہ اُبھرے ہوئے ملیں گے یہ کسی کے نقش پا کی تلاش نہیں کرتے بلکہ خود لوگ اُن کے نقش پا کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

شاہ جی کی زندگی جس نہج پر استوار ہے اس میں ادب و سیاست کا ایک دماغی امتزاج ہے ظاہر ہے کہ ایک دماغی آدمی کی زندگی کھلی کتاب ہوتی ہے اس میں ادق عبارتیں سرے سے ناپید ہوتی ہیں وہ جذبات پر جیتا اور جذبات پر مرتا ہے اس میں احساس کی شدت اور استغنا کی شرافت تا حدِ کمال ہوتی ہے اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کون اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے اس کی ذات ہی اس کا پیمانہ ہے وہ گرد و پیش سے متاثر ہوتا اور چاہتا ہے کہ گرد و پیش اس سے متاثر ہوں اس کی رُوح اس وقت معراج پر ہوتی ہے جب وہ عام چہروں میں اپنا ہی عکس دیکھتا ہے ؎

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

۱۹۴۷ء کا ذکر ہے غالباً مارچ کا مہینہ تھا۔ عام فسادات پنجاب میں بھی پھوٹ چکے تھے شاہ جی اس سے تو خوش تھے کہ انگریزوں کے چل چلاؤ کا زمانہ ہے لیکن اس کا انھیں بہت ہی دکھ تھا کہ خون خرابہ بے قابو ہو چکا ہے۔

ہمارے اصرار پر وہ امرتسر سے چلے آئے اور دفتر احرار لاہور میں مقیم تھے۔ دن بھر محفلیں جمتیں گئی رات تک دربار لگا رہتا۔ عام عقیدت مند جمع ہوتے اور ان کے انوارِ سخن سے

جھولیاں بھرتے لیکن ان دنوں ان کے چہرے پر ہنسی کے آثار بہت تھوڑے تھے۔

اس سے پہلے وزارتی مشن کے زمانے میں ہم کوئی دو ماہ دہلی میں اکھٹے رہے تھے اور وہ زمانہ اپنی بوقلمونیوں کے باعث تاریخ کا ایک یادگار حصہ تھا۔ میں نے شاہ جی سے عرض کیا کہ میری بعض یادداشتیں ادھوری ہیں اگر آپ اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالیں تو یہ یادداشتیں مکمل ہو سکتی ہیں لیکن وہ طرح دے گئے ان کے نزدیک اس کی ضرورت ہی نہ تھی وہ تحریر کو ایک فتنہ سمجھتے اور اپنے اس عقیدے کو ہمیشہ دہراتے ہیں کہ جب سے حافظہ کی جگہ تحریر نے لے لی ہے نہ صرف انسان کو عقلی اعتبار سے ضعف پہنچا ہے بلکہ ہر کہیں عجیب الخلقت تنازعوں کی آب و ہوا پھیل گئی ہے وہ عام لوگوں کی طرح اس دور کو ترقی کا دور نہیں کہتے بلکہ ان کے نزدیک یہ خسران کا دور ہے اور تحریر اس خسران کی پیچ دار بنیادوں میں سے ایک۔

بھائی میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے؟ —— مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ابوطالب کلیم کی زبانی اپنی ہی نہیں، ہماری بھی سرگزشت لکھ دی ہے۔

بدنامیِ حیات دو روزے نہ بود و بیش

آں ہم کلیمؔ با تو چگویم چساں گزشت

یک روز صرفِ بستنِ دل شد باین و آں

روزے دگر بکندنِ دل زین و آں گزشت

تفصیل طلب کیجیے تو مسکرا دیں گے، آغا فہمیدیم اور بس —— لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا روپ قطعی مختلف ہے مولانا اپنے سے باہر جھانکتے نہیں اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مولانا کے لیے تخلیہ صحبت عیش ہے، شاہ جی کے لیے جان کنی، مولانا کتابوں کی رفاقت کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں کر پاتے شاہ جی نے

نے عمر بھر کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی ہے۔

ما قصّۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

——— یہاں لاہور میں اُن کی آزردگی بڑھتی ہی گئی۔ ہر دن ایک نیا سانحہ لاتا۔ پہلے انھیں ہندوستان کی بربادی کا غم تھا، اب وُہ مسلمانوں کے لیے بے چین تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو تیاری کے بغیر ایک ایسی آگ میں جھونک دیا گیا ہے جس کا واحد نتیجہ ہمہ گیر تباہی ہے۔ وُہ کلکتہ، نواکھالی اور بہار کے حالات سے پہلے ہی مغموم تھے۔ اب جن حالات میں خضر وزارت کا استعفا ہُوا تھا اور اس استعفا سے پہلے مُسلم لیگ نے جو مظاہرے اور محاذ ہرے برپا کیے تھے۔ شاہ جی کی طبیعت پر اُن کا ایک منفی اثر تھا۔ فسادات جنگل کی آگ تھے اور وُہ انسانی خون کا تماشا دیکھ ہی نہ سکتے تھے، فرماتے:

"بند ٹوٹ چکا ہے اور سیلاب کا رُکنا محال ہے"

خضر وزارت کے خلاف بلاناغہ احتجاجی جلوس نکل رہے تھے۔ ان جلوسوں میں زبان خلق کی ساری حصرمتیں جمع ہو گئی تھیں۔ شاہ جی مغرب کے وقت دفتر کے چھجے میں آکھڑے ہوتے، ان مظاہروں کا نظارہ کرتے اور جب بے قابو نوجوانوں کی آوازیں شفق میں گھلنے لگتیں تو سرد آہ بھرتے اور کہتے:

"شورش! ——— مجھے صاف نظر آرہا ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ دُور دُور تک آگ لگی ہُوئی ہے، مکان جل رہے ہیں، دکانیں لٹ رہی ہیں اور قزاق عصمتیں اڑائے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ ماں بیٹے کو چھوڑ چکی، باپ بیٹی کو ہار چکا ہے۔ چاروں طرف قیامت کا صُور پھُونک گیا ہے۔"

پھر یکایک ملنگوں کے انداز میں نعرہ گونجانے لگتے:

"کردے چٹیل میدان مولا کردے چٹیل میدان" ـــــ ـــــ لعنت بر پدرِ فرنگ اور فرنگ پر خاص زور دیتے۔ تبرّیٰ کی یہ آواز کبھی کبھار شاہ محمد غوث کی مسجد سے اُٹھتی ہوئی اذان سے جا ٹکراتی ـــــ نیاز مند شاہ جی کے اس قلندرانہ نعرے پر مُسکراتے اور شاہ جی جھنجھلا کر فرماتے :

"میاں آج ہنستے ہو کل روؤ گے، تم نہیں دیکھ سکتے، مَیں دیکھ رہا ہوں جو کچھ بیت رہا اور جو کچھ بیتنے والا ہے، ایک وبا پھُوٹ چکی، ایک وبا آرہی ہے تب اُن کی زبان پر قرآن مجید کی آیتیں جاری ہو جاتیں، اُن کی قرأت میں گداز پیدا ہو جاتا۔ ان کے لحن میں آنسو آجاتے اور ہم بھے کہ اُن کا مُنہ تکا کرتے۔ ہمارا وجدان شہادت دیتا کہ فقیر غلط نہیں کہہ رہا ہے لیکن عقل سپر انداز ہونے سے انکار کرتی "جی نہیں شاہ جی حالات ابھی اتنے خراب نہیں انگریزوں کا مفاد ـــــ ؟"

وُہ فقرہ ہی توڑ لیتے۔

"ہاں بھائی انگریزوں کا مفاد اسی میں ہے کہ بستیاں کوملہ ہو جائیں، لوگ قتل ہوں۔ آخر جانے سے پہلے فرنگی بابا آزادی کی قیمت لے کر ہی جائے گا۔ تم نے آزادی مانگی تھی یہ لو آزادی ـــــ ؟ یہ اس کی پہلی قسط ہے"

شاہ جی ! سیاست؟

"ہاں میں جانتا ہوں سیاست کے معنی ہیں مکر، کلام اللہ میں بھی یہی معنی بیان ہوئے ہیں میں نے لفظِ سیاست سے زیادہ کوئی شریر لفظ نہیں دیکھا۔ یہ خدع و فریب کے ایک ایسے اجتماعی کاروبار کا نام ہے جس سے بابو لوگ اغراض کی دُکان چمکاتے ہیں"

ـــــ اور میں جی ہی جی میں سوچ کر چپ ہو رہتا ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

عام حالات میں یہ باتیں بے وزن تھیں۔ جس شخص کی نصف زندگی خود سیاست میں گزری ہو پھر جس نے "قبرستانوں" میں "اذانیں" دی ہوں۔ اس کا سیاست کے بارے میں یہ ذہن ایک لطیفہ ہے۔ یہ ذہن انھوں نے تحریکِ خلافت کے بیٹھ جانے پر زعمائی کرتوت سے متاثر ہو کر قائم کیا اس پر سختی سے قائم ہیں اور تقسیمِ ملک کے بعد تو وہ سیاست ہی کو منکرات میں سے سمجھتے ہیں گو تحریکِ خلافت کے بعد بھی انھوں نے سیاست میں حصہ لیا لیکن اپنی مرضی سے نہیں دوسروں کی مرضی سے۔ ان کا ایک خاص معیار ہے جس سے وہ حالات کے بجائے افراد کا جائزہ لیتے ہیں انھیں اس سے غرض نہیں کہ حالات کیا کہتے ہیں۔ ان کے لیے بس یہ کافی ہے کہ احباب کیا کہتے ہیں جب تک دوست ان کے اعتماد کو مجروح نہ کریں وہ ان کے دماغ سے بھی سوچ لیتے ہیں ملک کی سیاسی تحریکوں کے اٹھانے میں ان کے دماغی فیصلے شاذ ہی شریک ہوئے ہیں لیکن ان تحریکوں کے چمکانے میں ان کی زبان برقی لہر ثابت ہوئی ہے۔

وہ سب سے بڑے عوامی خطیب ہیں لیکن عوام کو کالانعام ہی سمجھتے ہیں۔ انھیں جدید سیاسی اصطلاحوں سے کوئی رغبت نہیں، ان کے نزدیک تحریکات میں عوامی قوت فعال ضرور ہوتی ہے لیکن سرچشمہ نہیں وہ نتائج کو مشیتِ ایزدی کے تابع سمجھتے ہیں۔ ان کی بے نیازی حد سے بڑھی ہوئی ہے انھیں اخبارات سے نفرت ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اخباروں نے آغاز سے اب تک بڑے بڑے جھوٹ گھڑے ہیں اگر اس جھوٹ کا بوجھ ماؤنٹ ایورسٹ پر پڑتا تو وہ بھی زمین میں دھنس چکی ہوتی۔ انھیں اشتہار دینے یا بننے سے سخت نفرت ہے۔ ایسی کوئی ترغیب یا تحریص انھیں بے راہ نہیں کر سکتی اور نہ وہ خوشامد ہی سے رام ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ انسان کی ملعون کمزوریاں ہیں یہاں بڑے بڑے تخلیہ دوست رہنما اور گوشہ نشین مہاتما بھی اخباروں میں چھپنے کی آرزو سے بے نیاز نہ رہ سکے لیکن وہ ایک تنہا نظر آتے ہیں جنھیں اس کوچے سے رسم و راہ رکھتے ہوئے عار آتی ہے وہ غصہ

میں اس کو جہنم کی آگ کہ اُٹھتے اور ہمیشہ اس سے کنّی کتراتے ہیں

"بابو! میں اس میدان کا کھلاڑی نہیں"

اور جب کوئی فوٹو گرافر اُن کی تصویر لینا چاہے تو چہرے پر رومال ڈال لیں گے یا ڈانٹ کر بٹھا دیں گے۔ کیا کرتے ہو میاں؟ یہ میری تصویر بنا کر کیا کروگے؟ میری تصویر میرے افکار ہیں میرے خیالات کو اُتار سکتے ہو تو دل کے فوکس میں اُتار لو یہ سب سے اچھی تصویر ہوگی۔ دُنیا میں نہ سہی عاقبت میں کام آئے گی اور ہاں میری تصویر ——؟

بیٹا پاس بیٹھا ہو تو اس سے کہیں گے "کھڑے ہو جاؤ شاہ جی!"

پھر فوٹو گرافر سے مخاطب ہوتے ہوئے ——————

"میری تصویر میرا بیٹا ہے اس کو دیکھ لو"

"اور ہاں میری نظر سے دیکھنا! کتنی اچھی تصویر ہے؟"

خود عمر بھر میں ایک ہی تصویر کھنچوائی ہے دو چار تصویریں اور بھی ہیں لیکن سب چوری چھپے کی۔ وہ تصویر کا رکھنا اور کھنچوانا شرعاً ممنوع سمجھتے ہیں۔ انھیں مصوری اور عکاسی کی خلقی اور غیر خلقی بحثوں سے کوئی واسطہ نہیں وہ اسے کٹ حجتی سمجھتے ہیں اور جب اُن سے یہ کہیں کہ فلاں فلاں بزرگ کی تصویر بن چکی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت ہے) کی تصویریں عام ہیں تو وہ مسکرا دیں گے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں اُن کا مقلد تھا۔ شریعت میں نہیں میرے لیے اُن کا کوئی فعل حجت نہیں۔ بابو! میرے میاںؐ نے منع فرمایا ہے اُن کے قول کے بعد سب اقوال ہیچ ہیں"۔

اور وہ میاں کے لقب سے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ امی وابی) کو

یاد کرتے ہیں۔

راقم نے عرض کیا :

——— "شاہ جی ! آپ تو کُرتے کے ساتھ شلوار پہنا کرتے تھے لیکن یہ کچھ دنوں سے آپ نے تہ بند پہننا شروع کر رکھی ہے؟ فوراً ہی بات کاٹ لی :

"بھائی حضور کا لباس ہے، میاں پہنتے تھے"۔

ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد ہر سوال ختم ہو جاتا ہے۔ شاہ جی کی دو تہائی زندگی سیاسیات میں کٹی ہے۔ ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا ہے ان دنوں کے سوا جو قید خانے میں بسر ہوئے کوئی دن بھی تقریر کے بغیر نہیں گزرا سینکڑوں قومی و ملکی مسائل پیدا ہوئے اور ہر مسئلے میں لوگوں سے کہا سنا لیکن بیان بازی سے گریزاں ہی رہے جہاں اخبار نامہ نگاروں نے گھیرا افسردہ ہو گئے۔ ان تیس پینتیس برس میں انھوں نے اخبارات میں کسی عنوان سے کبھی کوئی بیان نہیں دیا۔ اس اعتبار سے ان کی زندگی میں ایک طویل چپ خموشی ہے مجلس احرار نے اپنا اخبار جاری کیا لیکن وہاں بھی کبھی کوئی بیان نہیں چھپوایا جو بیان یا پیغام اُن سے منسوب ہیں اُن میں بھی اُن کی منشا ہے قلم نہیں۔ راقم کے علم میں صرف ایک مثال ایسی ہے جو اس سے مستثنیٰ ہے اور وہ ایک خط ہے جو پاکستان بن جانے کے بعد روزنامہ "آزاد" میں اُن کے قلم سے نکلا تھا۔ تقریباً تمام بڑے ایڈیٹروں سے اُن کے تعلقات رہے لیکن چھپنے چھپانے سے فرار ہی کیا۔ کہیں کسی نامہ نگار نے گھیر لیا۔ کوئی سٹاف رپورٹر آنکلا کسی نمائندے سے ٹکر ہو گئی اب وہ سوال کر رہا ہے شاہ جی انڈیا ایکٹ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ شاہ جی دامن بچا رہے ہیں ———

——— "بھائی میں آج کل قرآن مجید کی فلاں آیت پر غور کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے فلاں فلاں مفسر نے اس بارے میں ٹھوکر کھائی ہے البتہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ میں بات

اُبھرتی ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی تفسیر سامنے نہیں غالباً انھوں نے بھی اُن سے اتفاق کیا ہے"۔

اخبار نویس پوچھتا ہے :

"دو قومی نظریے کے مسئلے میں آپ علامہ اقبالؒ سے متفق ہیں یا مولانا حسین احمد مدنی سے؟ آپ نے بحث تو دیکھی ہوگی؟ ——— بھائی میں نے جانبین کے فرمودات کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ آج کل بیاض کھنگالنے میں لگا ہوں۔ کوئی ۲۵ برس پہلے "جب آتش جوان تھا"، یہ بیاض مرتب کی تھی۔ سُنو یہ شعر کس قدر پیارا ہے۔

ہر کسے را دامن ترہست اما دیگراں
بازمی پوشند و ما در آفتاب انداختیم"

اخبار نویس : "شاہ جی عالمی وفاق کا قیام ممکن ہے؟ جمہوریت اس وفاق کا ذریعہ بن سکتی ہے یا فسطائیت یا اشتمالیت"؟

لیکن شاہ جی مُوڈ کے آدمی ہیں وُہ آپ کو یہ سوچنے کی مُہلت ہی نہیں دیں گے کہ انھوں نے عصری تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں؟ اُن کے نزدیک ہر چیز کی ایک ہی ترازو ہے اور وُہ ہے، قرآن مجید، اُسوۂ رسُول، سیرِ صحابہ اور عُلمائے اُمّت کا فہم و تدبّر۔ اُن ائمہ اربعہ کے سوا جن کی فقہ چلتی ہے وُہ کسی جدید فقہ کے قائل نہیں اُن کا واحد معیار اسلاف ہیں اس دَور کی بیشتر تحریکیں اُن کے نزدیک ذہنی بدکاری ہیں اُنھوں نے سرے سے ان تحریکوں کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ اُن کے بارے میں اُن کی معلومات محدُود اور بالواسطہ ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی بالکل نہیں جانتے اور عصری تحریکوں کا علم انگریزی میں رسُوخ کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ہے، گو ایک حد تک انگریزی زبان کے مزاج سے آشنائی بھی اس خلا کو پُورا کرتی ہے،

لیکن شاہ جی دونوں سے دست کش ہیں ——————

اُن کا تعلق دیوبند کے اس مدرسۂ فکر سے ہے جس نے انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام قرار دیا تھا۔ وُہ دیوبند کے فارغ التحصیل نہیں لیکن ان کی ذہنیت کا خمیر اُسی خاک سے اٹھا ہے جن اکابر علماء نے سر سید کے مشن کی مخالفت کی وُہ ان پر ہزار ہزار رحمتیں بھیجتے ہیں اُن کے عقیدہ میں خرابی کی اصل جڑ انگریزی تعلیم ہے جس نے مسلمانوں کے بدن سے "رُوحِ محمدؐ" نکال لی ہے اگر اس خرابی کو اس وقت روک لیا جاتا تو آج نقشہ مختلف ہوتا اور مسلمان اس طرح نہ گرتے جس طرح گر چکے ہیں پھر ان کا یہ خیال معناً درست ہے کہ زبان کے بدلنے سے انسان بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عربوں نے جن ملکوں کو فتح کیا وہاں کی زبان عربی بنا ڈالی اور عام باشندے اسلامیات میں گھُل مل گئے۔ جہاں عربی زبان کا تسلط نہ ہُوا وہاں جہانبانی کی مدت گزرتے ہی عمارت بیٹھ گئی۔ ہندوستان کی نظیر سامنے ہے یہاں اسلام حکمرانوں کی معرفت نہیں بلکہ اہل اللہ کی وساطت سے آیا لیکن عام آبادی میں اسلامی فکر رچ بچ نہ سکا۔ نتیجہ معلوم کہ قاہرہ ہمیشہ کے لیے اسلام کا شہر ہو گیا اور دہلی اس شرف سے محروم ہی رہا۔ جن مسلمان خاندانوں نے ہندوستان میں حکومت کی اُن کا اسلام کئی واسطوں سے متاثر تھا وُہ اسلام کی اصل زبان سے بھی ناآشنا تھے، خود فارسی کو مسلمان ہونے میں دیر لگی اور قبولِ اسلام کے باوجود اس میں عجمی رنگ برقرار رہا۔ اس کی کوکھ سے اردو پیدا ہوئی جس نے خاص قسم کے اثرات پیدا کیے باوجودیکہ اس زبان کے بنانے اور بولنے والے مسلمان تھے لیکن زبان مسلمان ہو گئی۔ اسلام اردو نہ ہو سکا۔ انگریزی کا معاملہ ہی دُوسرا تھا۔ اوّلاً نصاریٰ کی زبان، ثانیاً فاتحوں کی بولی۔ ثالثاً اُسے وہ لوگ لے کر آئے تھے جو کلیسا کے ردِّ عمل سے نفسِ مذہب کے خلاف اُبھرتی ہُوئی تحریکوں کے ہراول تھے۔ حد یہ کہ صنعتی انقلاب نے زبان کا مزاج ہی بدل ڈالا تھا...... ان حالات میں جن علماء نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے روکا اور ان میں اس کے خلاف ایک عمومی تحریک

کی نیو اُٹھائی۔ اُن کے ذہن میں یقیناً حالات کی خرابیوں کا یہ نقشہ ہوگا۔ لیکن اب دُنیا ایک صدی آگے بڑھ چکی ہے اور آج انگریزی کو دُنیا میں وہی عروج حاصل ہے جو کبھی عربی کو تھا۔ پھر انگریزی محض ایک زبان ہی نہیں رہی بلکہ سائنسی انکشافات کی طرح ناگزیر ہو گئی ہے لیکن شاہ جی کو اس سے اتفاق نہیں اُن کے نزدیک انگریزی پڑھنا پڑھانا دونوں حرام ہیں۔

ایک دفعہ میں نے اُن کے بچّوں سے متعلق عرض کیا:

"شاہ جی انھیں انگریزی پڑھائیے، انگریزی مدرسوں میں بھیجئے اور ممکن ہو تو وکیل بنائیے آئندہ معاشرے کی باگ ڈور قانون دانوں کے ہاتھ میں ہے"

بس اس پر بگڑ بیٹھے:

"تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ انھیں زندہ دفنا دو —————— لعنت بر پدرِ فرنگ"

اور یہ اُن کا قلندرانہ نعرہ ہے

—————— کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی ایک خاص کھیپ سے ان کے دوستانہ مراسم ہیں ہندوستان ایک تھا تو اُن کے نیاز مندوں میں بڑے بڑے کمیونسٹ اور سوشلسٹ (ہندو اور مسلمان) شامل تھے۔ اُن کی ایک بڑی جمعیت کو ہمیشہ آپ سے لگاؤ رہا۔ بھی آپ کا احترام کرتے لیکن نہ وہ انھیں ہم خیال بنا سکے اور نہ یہ انھیں قائل معقول کر سکے۔ دونوں کے درمیان جذباتی رشتہ رہا۔ ان میں سے اکثر آپ کے صحبت یافتہ ہیں۔ مثلاً منشی احمد دین سوشلسٹوں کے سب سے بڑے مقرر تھے ان کا سیاسی راستہ ہمیشہ ہی مختلف رہا لیکن خطابت میں شاہ جی ہی کے خوشہ چین تھے۔

شاہ جی کمیونزم کو بھی اسلام کے خلاف یہودیوں کی لامتناہی سازشوں کا ایک حصّہ سمجھتے ہیں اُن کی دلیل یہ ہے کہ کارل مارکس یہودی تھا اور یہودی ہمیشہ سے اسلام کے خلاف سازشیں کرتے

آسکتے ہیں اس ضمن میں وہ اسلام کے خلاف کی گئی سازشوں کی پوری تاریخ اپنے خطیبانہ جوش میں بیان کر جاتے ہیں اُن کی یہ باتیں نئی نسل کے لیے سطحی ہوتی ہیں یا اجنبی یا پھر جذباتی لیکن ان کا بہاؤ اتنا تیز ہوتا ہے کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

کارل مارکس نسلاً یہودی ضرور تھا لیکن اس نے انسان کے اجتماعی اور انفرادی دُکھ کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جس کی اساس جدلیات پر ہے صیہونیت پر نہیں مگر شاہ جی تاریخ کی مادی تعبیر، طبقاتی کش مکش، جدلیاتی اصول اور سرمایہ و محنت کے معاشی مباحث کو اپنی خطابات میں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ —— ع

این دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ

جس تحریک یا جماعت میں خدا نہ ہو، اخلاقی قدریں اضافی سمجھی جائیں اور پیغمبر صرف مادی حالات کی تاریخی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آئے ہوں، شاہ جی اس تحریک یا جماعت کے داعیوں پر غضب ناک ہو کر لپکتے ہیں عام اشتمالی نوجوانوں کو وُہ گمراہِ مخلص خیال کرتے ہیں، لیکن دکان دار علما کی طرح وُہ نہ تو سرمایہ داری کا جواز پیدا کرتے ہیں اور نہ بڑی زمینداریوں ہی کے حق میں ہیں اُن کے نزدیک زمینیں خُدا کی ملکیت ہیں اور جو لوگ اُن پر ہل جوتتے ہیں وہی از رُوئے اسلام اُن کے حقدار ہیں جس نظامِ معیشت سے بھی استحصال پیدا ہو وُہ اس کے سخت خلاف ہیں اُنھیں خونیں انقلاب برپا کرنے میں بھی عار نہیں لیکن ان کے نزدیک رہنما "قرآن" ہے "سرمایہ" نہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں دہلی دروازہ لاہور کے باہر حکومتِ الٰہیہ کے موضوع پر بول رہے تھے۔ جانے کیونکر اشتراکیوں کا ذکر آ گیا، کسی نے لُقمہ دیا، حضرت اُن کا تو عقیدہ ہے کہ زمین سے سرمایہ داری اور آسمان سے خُدا کو نکال دو۔

بس پھر کیا تھا، گھنگھریالے بالوں کو جھٹکا دیا، پہلے ہنسے اور پھر تاؤ میں آگئے۔

"ٹھیک ہے بھائی ! ٹھیک ہے، ہائے اکبر الہ آبادی کس وقت یاد آگئے

(لے کے ساتھ) .....

"صدیوں فلاسفہ کی چُنان اور چُنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

کہاں خداوند ایزد متعال کہ "کُن" کے لفظ سے کائنات پیدا کی، کہاں رُوس، توے پر دانۂ اسپند، اُلٹا دو تو سُور ہو جائے"۔

بات کچھ نہیں محض الفاظ کا اُلٹ پھیر تھا لیکن اس ایک ادا نے مجمع کو گرویدہ کر لیا نعرہ ہائے تکبیر گونج اُٹھے اسی سحر سے خوف زدہ ہو کر ڈاکٹر اشرف نے ایک دفعہ شاہ جی سے کہا تھا "آپ لوگوں پر جادو کرتے ہیں جن سے اُن کے سوچنے کی قوتیں ماؤف ہو جاتی ہیں آپ کا علاج گولی ہے"۔

شاہ جی بعض عجیب و غریب خصوصیتوں کا مجموعہ ہیں ان کی باتیں جب وہ کسی تحریک کے افکار و حالات پر گفتگو کر رہے ہوں تو سیاسی ترازو میں ٹھیک نہیں بیٹھتی ہیں لیکن تاریخ کے اعتبار سے اس طرح صورت پذیر ہوتی ہیں کہ لوگوں کو اُن کے ملہم ہونے کا گمان ہوتا ہے بظاہر ان باتوں میں عقلی بندشیں سُست ہوتی ہیں لیکن قلندرانہ شوخیاں حرف حرف سے پھٹی پڑتی ہیں ان کی یہ درویشی جس سے سیاست کو دُور کی نسبت بھی نہیں ان لوگوں میں جھنجلاہٹ پیدا کرتی ہے جو سیاست کو مادیات کے آئینے میں دیکھتے ہیں لیکن اس جھنجلاہٹ کے باوجود جب نتیجوں کی منزل سامنے آتی ہے تو ان باتوں کا بہت بڑا حصہ صحیح ہوتا ہے۔ خضر وزارت ٹوٹی تو اُن کی پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہونے لگیں !

۱ ——— چڑھتے دن سے گئی رات تک وہ مکانوں سے اٹھتے ہوئے شعلوں کا نظارہ

کرتے، کوئی پوچھ لیتا تو فرماتے :

"میاں کیا پوچھتے ہو، شعلے نہیں ٹاؤن کے ٹکڑے ہیں ٹکڑے"

شاہ جی نے فسادات کے آغاز ہی میں امرتسر چھوڑ دیا تھا۔ امرتسر سے کوئی دوست آتا

تو اُس سے کہتے : "وہاں کیا رکھا ہے چلے آؤ، جو خط کھینچ چکا ہے وہ اب مٹنے کا نہیں ...

مجھے دیکھو حرفِ معطل ہو گیا ہوں ———

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں ہائے بند ترے

عام طور پر ایک ہندو اور ایک مسلمان اخبار پڑھتے تھے لیکن اب وہ التزام بھی ٹوٹ

چکا تھا۔ اخبار مل گیا، پڑھ لیا۔ نہ ملا، تو دوستوں سے خبریں معلوم کرلیں یا ریڈیو سن لیا۔

۱ ——— ان کی سفری کائنات ایک چھوٹا سا بستر، ٹین کا بیمار بکس، بید کی ٹوکری،

تانبے کا لوٹا اور گول سا پاندان ہے۔ کوئی نئی کتاب مل جائے تو جب تک پڑھ نہ لیں، ساتھ ہی رکھتے

ہیں اُن دنوں "غبارِ خاطر" کا دستخطی نسخہ ہمراہ تھا، اُس کا مطالعہ شروع کیا تو اپنی کہانی بھی کہنے

لگے، حافظ کی گرہیں کھلنے لگیں۔ عربی، فارسی، اردو، پنجابی اور ملتانی میں اُنھیں بے شمار شعر،

مثنویاں، قصیدے، مسدسیں، مخمسیں، مرثیے، نوحے، نعتیں، غزلیں، نظمیں ازبر ہیں اور مولانا آزاد

کی طرح اپنے حافظے پر انھیں بھی بڑا ناز ہے۔

"یہ اشعار آج سے کوئی بتیس سال پہلے پڑھے تھے، فلاں شعر شاد عظیم آبادی سے سُنا تھا

اب تک یاد ہے۔ نظیری کے فلاں فلاں شعر نانا مرحوم کے بیاض سے نقل کیے تھے۔ میاں!

فارسی کا ذوق تو اب عنقا ہو رہا ہے۔ ادھر اردو بھی اب نئے نئے تجربوں کی زد میں ہے

شاعری نے ایک نیا بچہ جنا ہے نظمِ معرّیٰ یا نظمِ آزاد، مرزا غلام احمد کی نبوت اور نظمِ معرّیٰ

میرے لیے ناقابلِ فہم ہیں ——— لعنت بر پدرِ فرنگ!

مدت العمر پنجابی کی شوخ و شنگ شاعری کا شوق رہا ——— لیکن عمر کے ساتھ ہاتھ اٹھا لیا۔ ایک دفعہ مولانا آزاد کو ہیر وارث شاہ کا ایک بند سنایا۔ اس وقت تو مولانا عادتاً ہاں میرے بھائی کہہ کر چپ ہو رہے لیکن دس بارہ برس بعد ملے تو فرمایا: "شاہ جی کوئی کہہ رہا تھا آپ تقریر میں گالی دینے لگے ہو؟"

"حضرت، آپ سے کس نے کہا؟"

"میرے بھائی، نام تو یاد نہیں آ رہا۔ بہر حال کوئی صاحب ضرور تھے"۔

"تو حضرت، آپ نے اعتبار کر لیا؟"

"میرے بھائی اعتبار کی بات نہیں، ایک زمانہ میں آپ نے ہیر وارث شاہ کے چند شعر سنائے تھے، اُن میں کچھ ایسے ہی کلمات تھے۔ میں نے سمجھا شاید زبان لڑکھڑا گئی ہو"۔

اب لے دے کے بُلھے شاہ کی کافیاں یاد ہیں یا بابا فرید کا کلام، اور وہ بھی جستہ جستہ جس زبان میں بابا فرید شعر کہتے ہیں وہ دو ضلعی زبان ہے اور مقابلۃً دشوار، بلّھے شاہ سریع الفہم ہیں اور ان کے ہاں صاف گوئی زیادہ ہے ——— ع

سچ کہندیاں بھانبڑ مچدا اے

"ہاں بھائی سچ کہنا فرنگی کے دور میں بہت بڑا جرم ہے"۔

"جی نہیں شاہ جی ہر دور میں جرم رہا ہے"

"تم ٹھیک کہتے ہو بھائی لیکن ہمارا معاملہ تو اس دور سے ہے"

میں چاہتا تھا شاہ جی اس موضوع پر کھلیں اور میں ان پر بزعمِ خود ثابت کروں کہ انسان کو اس دور میں مقابلۃً زیادہ حقوق و مراعات حاصل ہیں اور پہلے تمام دور سیاسۃً گھناؤنے

اور ڈراوے تھے۔ میں نے ان سے کہہ ہی دیا، شاہ جی مسلمان بادشاہوں نے بھی تو راستباز زبانوں کے کاٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی؟ آج جن لوگوں کو تاریخ اسلام کی سب سے بڑی شخصیتیں کہا جاتا ہے ان کے ساتھ حکام اور عوام نے یکساں برتاؤ کیا آج استبداد کی اجتماعی حمایت میں کم سے کم عوام تو شریک نہیں ہوتے؟

"میاں! یہ سب کچھ میں نے بھی پڑھا ہے۔ تم فرنگی بابا کو نہیں جانتے۔ اس نے روحیں قتل کر دی ہیں روحیں۔ اسلام اٹھ گیا مسلمان رہ گئے ہائے اکبر کس وقت یاد آیا (لے میں)

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ان کے ہاں بھی اکبر الٰہ آبادی کے سے احتجاجی لیکن منفی جذبات ہیں لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو ایک مصلح اور انقلابی میں ہوتا ہے۔ اکبر مسکرا کر چٹکی لیتے اور شاہ جی جھنجلا کر تھپڑ مارتے ہیں۔ ان کے دل میں ہمیشہ کے لیے یہ گرہ پڑ چکی ہے کہ انگریز سے بڑا دشمن اسلام کوئی نہیں۔ ان کے سامنے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی پوری تاریخ ہے۔ انھوں نے سیاسیات میں قدم رکھا تو پہلی جنگ عظیم کے نتائج آنکھوں کے سامنے تھے جو خیالات ورثہ میں پائے وہ استعمار کے مخالف علماء کے خیالات تھے۔ خلافت عثمانیہ جس طرح پارہ پارہ ہوئی اور عربی ملکوں میں قومیت کے نام پر جو گل کھلائے گئے۔ ان کی انگریزوں سے برگشتگی کے لیے کافی تھے۔ ہندوستان میں تحریک خلافت اور جلیانوالہ باغ کے حادثے نے مہمیز کا کام کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ جی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ ان کا کہنا ہے کہ قاسم نانوتوی اور محمود الحسن رحمہما اللہ تعالیٰ نے ایک راستہ دکھایا تھا میں تو توشۂ آخرت کے لیے اسی پر چل رہا

ہوں۔ مجھے اسی کے لیے جینا اور اسی پر مرنا ہے ؎

حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے مے خواہد
ورنہ ما را بہ جہانِ تو سروکار کجاست

الغرض ان کی ذات رُبع صدی تک انگریزوں کے خلاف ایک تحریک بنی رہی ہے اس لحاظ سے وُہ ایک ادارہ ہیں انھوں نے ایسے علاقوں میں انگریز دشمنی کے بیج بوئے ہیں جہاں اُن کے اپنے الفاظ میں اور گو یہ الفاظ کسی قدر سخت ہیں: "پنجابی مائیں بڑی چاہت سے ٹوڈی بچے جنتی ہیں"

ایک دوست نے ان سے سوال کیا "ملکی سیاسیات میں آپ کی Contribution کیا ہے اور آزادیٔ ہندوستان کا وہ کون سا مثبت نظریہ ہے جس کے لیے آپ کوشاں ہیں؟"

شاہ جی نے فرمایا ——— "یہ فیصلہ تو آپ کیجیے کہ میری Contribution کیا ہے ہیں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہن سے انگریزوں کو نکال پھینکا ہے۔ میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سری نگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے۔ وہاں پہنچا ہوں جہاں دھرتی پانی نہیں دیتی۔ رہا یہ سوال کہ آزادی کا وہ کون سا تصوّر ہے جس کے لیے میں لڑ رہا ہوں تو سمجھ لیجیے کہ اپنے ملک میں اپنا راج۔ آپ غالباً مجھ سے کسی کتابی آئڈیالوجی کا پوچھ رہے ہوں گے؟ بابو ——— یہ کتابی نظریے عموماً روگ ہوتے ہیں، فی الحال جو مرحلہ درپیش ہے وُہ کسی مثبت تصوّر کا نہیں منفی تصوّر کا ہے۔ ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ غیر ملکی طاقت سے گلو خلاصی حاصل ہو۔ اس مُلک سے انگریز نکلیں۔ نکلیں کیا؛ نکالے جائیں تب دیکھا جائے گا کہ آزادی کے خطوط کیا ہوں گے؟ آپ تو نکاح سے پہلے چھوارے بانٹنا چاہتے ہیں۔ پھر مَیں کوئی دستوری نہیں، سپاہی ہُوں، تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہا اور

لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں سُور بھی میری مدد کریں گے تو میں اُن کا مُنہ چوم لوں گا۔ مَیں تو ان چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لیے تیار ہُوں جو "صاحب بہادر" کو کاٹ کھائیں۔ خدا کی قسم میرا ایک ہی دُشمن ہے۔ انگریز! اس ظالم نے نہ صرف مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی ہمیں غلام رکھا اور مقبوضات پیدا کیے بلکہ خیرہ چشمی کی حد ہو گئی کہ قرآنِ حکیم میں تحریف کے لیے مسلمانوں میں جعلی نبی پیدا کیا، پھر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی اور اب اس کو چہیتے بچے کی طرح پال رہا ہے"۔

اُن کی اس جھنجلاہٹ میں ایک قسم کی جارحانہ لگن ہوتی ہے جو باتیں اقبال نے قلندرانہ رنگ میں کہی ہیں اور جن میں "پیچ و تابِ رازی" کے بجائے "سوز و سازِ رُومی" کی شدت مضمر ہے شاہ جی ان کے انتھک مفسر ہیں۔

اقبال و اکبر کی مثالیں یہاں اس لیے زیرِ قلم آئی ہیں کہ قارئین شاہ جی کی سیرت کے اس پہلو کو آسانی سے سمجھ لیں اکبر اور اقبال دونوں کا مشن ایک تھا لیکن دونوں کا طرزِ بیان مقاصد میں ہم آہنگی کے باوصف مختلف رہا۔ اقبال کا انداز عقلی ہے اکبر کا جذباتی —— اکبر ایک گرتی ہوئی دیوار سے دل برداشتہ ہو کر گرد و پیش کے ظواہر پر سنگ دلانہ قہقہے لگاتے ہیں لیکن اقبال اس دَور کی تمام عصری تحریکوں کے نقاد ہیں وہ انگریزوں کے صرف اسی لیے مخالف نہیں کہ اُنھوں نے کسی مدرسۂ فکر سے عقیدے کے طور پر بعض مسلوم سچائیاں حاصل کی ہیں ان کی انگریزوں پر چوٹیں ایک مسلسل مطالعے اور لگاتار مشاہدے کا نتیجہ ہیں مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں ——

کرے قبول اگر دینِ مُصطفٰے انگریز

سیاہ روز مُسلمان رہے گا پھر بھی غُلام

گویا اقبال کے علم و نظر کی معراج اس خیال پر ختم ہوتی ہے جس خیال کو شاہ جی کے

ہاں محض عقیدہ کا درجہ حاصل ہے اور جو جذبہ سے شروع ہو کر جذبہ ہی پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ جی کا یہ جذباتی سراپا انتہائی دلآویز ہے اُنھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد کی بنیاد محض اس اصل پر نہیں رکھی کہ وہ ایک استعماری قوت ہے اُس کا نو آبادیاتی نظام استحصال محض ہے اور وُہ دُنیا کے سب سے بڑے سامراج کی مظہر ہے ان کی بنیاد مخاصمت میں بعض دُوسری باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں مثلاً۔

"۱۸۵۷ء کا غدر اور وہ اسے "غدر" کہنے والوں کو غدّار کہتے ہیں بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی، شہزادوں کا خونی دروازوں پر لٹکایا جانا، آزاد قبائل کے پٹھانوں پر انگریزوں کی مسلسل بمباری، گیلی پولی کے مقام پر مصطفیٰ کمال کے خلاف کھڑوں، ٹاڈوں اور ٹونوں کی نبرد آزمائی، قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کا بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جانا، غلاف کعبہ کا جلنا، مہدی سوڈانی کا خرطوم کے صدر دروازے پر سُولی پانا، اس کی لاش کا جلایا جانا اور راکھ کا اُڑانا، شاہ عبدالقادر جیلانی کے بغداد پر گولہ باری اور حرم کے کبوتروں کا زخمی ہونا۔۔۔۔"

ان سانحات کو قرآن و حدیث سے اس طرح نکھارتے ہیں کہ ہزارہا لوگ گھنٹوں دم بخود بیٹھے رہتے اور ان کے اعجاز بیان پر سر دُھنتے ہیں۔

"شاہ جی اپنی سوانح عمری ہی لکھیے؟

"کس کے لیے ——؟

"ہمارے لیے"

"آخر تیس بتیس برس تم لوگوں میں جھک مارتا رہا ہوں۔ اُس سے تم نے کیا حاصل کیا کہ اب چند اوراق کی کہانی سے حاصل کر لوگے؟"

"اچھا اپنے لیے لکھیے"۔

"میں لکھی لکھائی کہانی ہوں، ہر روز اپنے کو پڑھ لیتا ہوں"۔

"شاہ جی اس طرح بہر حال ایک تاریخ ہو جائے گی"

"پھر وہی بات؟ تاریخ کیا؟ اور کس کے لیے؟ پہلے ہی لوگوں نے تاریخ کے کس حصے سے سبق لیا ہے کہ اب اپنی زندگی لکھنے بیٹھوں؟"

"شاہ جی یہ "زبان" کا نہیں "قلم" کا زمانہ ہے!"

"ٹھیک ہے بھائی! لیکن لکھوں کیا؟"

"کچھ تو کہیے کہ زمانہ گوش بر آواز ہے"۔

"ہائے ذوق ساری سوانح عمری تو اس شعر میں کہہ گیا ہے۔ (لے ہیں)

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

"چلیے اسی شعر کو طرازِ عنوان بنا کر بسم اللہ کیجیے"۔

"خوب! آخر صحافی ہو نا، قلم اٹھایا اور صحفوں کے صفحے سیاہ کر ڈالے۔ زندگی میں محض سوانح ہی نہیں ہوتے، کچھ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں؛ بعض گفتنی بعض ناگفتنی۔ ناگفتنی ہیں کام کی کوئی چیز نہیں اور گفتنی میں خطرات ہی خطرات ہیں ؎

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم پختہ شدم، سوختم!

آج سے چوتھائی صدی پیش تر ایک سفر شروع کیا تھا۔ تب بے شمار لوگ شریک راہ تھے۔ ہر پڑاؤ پر قافلہ گھٹتا ہی رہا، حتّٰی کہ

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی!
تھک تھک کے اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

کچھ دوست راستہ بدل گئے کچھ اپنے ہی تعاقب میں پیچھے لوٹ گئے۔ اکثر بچھڑ گئے، بیشتر پچھڑ گئے ؎

اے ہم نفساں آتشم از من بگریزید
ہر کس کہ شود ہم رہِ ما دشمن خویش است

دوستوں سے فریب نہیں کیا، دشمنوں سے انتقام نہیں لیا۔ ذاتی دشمن بنائے ہی نہیں اور نہ بننے کی کوشش کی جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو گیا کہ انگریز دوست ہے اس سے کنارہ کیا جس نے ملی مقاصد سے بدعہدی کی۔ اس سے علیک سلیک کو بھی عار سمجھا، اب اس عمر میں لوگوں اور شہروں کے خمیر و ضمیر سے واقف ہو گیا ہوں۔ ع

ان کو بہت قریب سے پہچانتا ہوں میں

اور جب امید نہیں تو شکایت کس سے؟

مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیدان رفتم

صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش است —— اس سارے سفر کا حاصل ہے لگاتار چوالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا، پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہم کلام ہوتا تو جھوم اٹھتے۔ چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں، سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لیے طوفان بکنار ہو جاتے، درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہ اٹھتیں، صرصر سے گویا ہوتا تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے، جنگل لہرانے لگتے

صحرا سرسبز ہو جاتے۔ میں نے ان لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں ہمیشہ کے لیے بنجر ہو چکی تھیں ——— جن کے ضمیر عاجز آ چکے ہیں، جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے جن کی پستیاں انتہائی خطرناک ہیں جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں جن میں ٹھیرنا المناک اور جن سے گزر جانا طرب ناک ہے۔ جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت ہے جو صرف طاقت کی پوجا کرتے ہیں ——— اٹھارہ سو برس کی تاریخ ایسی حادثوں کی کہانی ہے ایسی چھچھورے ناسمجھ نازک اور متحرک جانوروں کو دیکھ کر زرتشت نے کہا تھا کہ اس کا آنسوؤں اور گیتوں کی طرف میلان ہوتا ہے ——— یہاں اُمرا دوزخ کے کتّے اور سیاستدان کھٹّو ہیں۔ اُن کے ساتھ نٹ اور اُن کے پیچھے لاشیں چلتی ہیں ان کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر نیکی اور ہر بُرائی کی زبان میں جھوٹ بول لیتے ہیں"

میاں بابو! ڈھونڈ سکتے ہو تو ان افکار میں میری سوانح عمری کی بُنیادیں ڈھونڈ لو

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا

اور نظر بہ ظاہر گرامی کا یہ مصرع بھی اسی اجمال کی شرح ہے۔

زدی کشتی شکستی سوختی انداختی رفتی

الغرض انھیں اپنی ناکامیوں کا شدید احساس ہے حتیٰ کہ اس آزردگی کے آثار اب اُن کے چہرے سے بھی عیاں ہیں ان کی متحرک اور روشن آنکھیں جن میں عُمر ڈھلنے تک ساری مستی شراب کی سی تھی، اب اندر کو دھنس چکی ہیں۔ اُن کے ماتھے کی بے شمار سلوٹیں جن میں ہزیمت کی ترشی منجمد ہے اپنے ماضی کے بوجھ سے مضمحل ہیں۔ آواز میں وہ کرارا پن اب بھی ہے لیکن کمر کی خمیدگی پکارتی ہے ع

لگا کے آگ کرئی کارواں روانہ ہُوا

۱۹۴۷ء کا زمانہ رستخیز سب سے طویل عرصہ تھا جو اُنھوں نے ایامِ قید کے علاوہ ایک ہی جگہ نشست جما کر بسر کیا وہ چند ماہ دفترِ احرار میں ٹھہرے رہے مگر اس اثنا میں کتاب کے جتنے ورق تھے ایک ایک کر کے کھُل گئے۔ وہ اپنی کہانی لکھیں تو حقیقۃً بڑے بڑے وقائع نگاروں کا اثاثہ مفلس کا چراغ معلوم ہو۔ اُنھوں نے ہندوستان کا ہر کونہ کھدرا چھان مارا ہے وہ بعض صوبوں ہی کی نہیں بلکہ شہروں، قصبوں، گاؤں اور بازاروں تک کی بولی ٹھولی محاورہ و روزمرہ جانتے ہیں۔ اُنھوں نے اُنگلیوں پر گنی ہوئی کتابیں پڑھی ہوں گی لیکن انسان اتنے پڑھے کہ ہندوستان میں کوئی بڑے سے بڑا عوامی لیڈر بھی اس خصوصیت میں ان کا ہمسر نہیں اس دَور میں وہ مہاتما گاندھی اور قائدِ اعظم سے بھی منزلوں آگے ہیں لیکن گاندھی جی کے الفاظ میں تالیاں پیٹنے والے مسلمان اُن کے ساتھ تھے اور ووٹ دینے والے مسلمان قائدِ اعظم کے ساتھ۔ انھیں ہندوستان کی بہت سی زبانوں پر قدرت حاصل ہے انھیں ہزاروں لطائف یاد ہیں۔ حاضر جوابی اور برجستہ گوئی میں اتنے مستعد ہیں کہ ان سے کئی کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ پنجاب کی بعض اضلاعی بولیاں تو ان کے رگ وپے میں خون کی طرح دوڑتی ہیں اُن کی گفتگو سے یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ اُردو بولیں، تو اہلِ زبان کا لب ولہجہ کملا جاتا ہے قرآن پڑھیں تو قرأت سے عرب ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ پنجابی بولتے وقت مُنہ سے موتی جھڑتے ہیں۔ غرض ہر ضلع کی بولی نوک زبان ہے ع

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

اکثر شخصیتوں کے قرب سے اُن کا ملمع اُتر جاتا ہے لیکن شاہ جی کے قرب سے اُن کا سونا اور دمکتا ہے وُہ بے پناہ ہیں، ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہو گئی ہیں یاد نہیں رہا، کون؟ لیکن ایک مصنف نے اپنے ممدوح کی سوانح عمری کے دیباچے

میں لکھا ہے :

"ان کے حالات زندگی لکھنا ایسا ہے جیسے تیرتھ یاترا؟"

شاہ جی تیرتھ نہیں لیکن ان کی یاترا سے ایک ایسے تیرتھ کا احساس ضرور ہوتا ہے جس میں صدیوں سے ایک ہی آواز گونج رہی ہے۔

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

# خاندانی حالات

**نام و نسب**

نام ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ شاہ بخاری، ننھیال کی طرف سے شرف الدین احمد۔ باپ کا نام ضیاء الدین احمد (رحمۃ اللہ علیہ) دادا کا نام نور الدین احمد (نور اللہ مرقدہٗ)

شاہ جی کے ایک عزیز مکرم سید مقیم شاہ بخاری حیدر آباد دکن میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ آج کل ملازمت سے سبکدوش ہو کر ماڈل ٹاؤن لاہور میں مقیم ہیں۔ اُن کے پاس خاندان کا شجرہ محفوظ تھا۔ حیدر آباد کی غارت زدگی میں ضائع ہو گیا۔ اس باب کی بعض معلومات انھی سے حاصل کی گئی ہیں۔

شاہ جی کا سلسلہ نسب ۳۶ ویں پُشت میں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کو اپنی خاندانی نجابت پر بڑا ہی فخر ہے۔ جہاں کہیں حاطب اللیل قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا، آپ نے اس فخر و شرف کا اظہار کیا چنانچہ ایک دفعہ دہلی دروازہ لاہور کے

باغ میں "مدحِ صحابہؓ" پر تقریر کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے اعتراض کیا:

"شاہ جی — ! کیا غضب کرتے ہو، سیّد ہو کے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کی مدح؟"

تاؤ میں آ گئے:

"تم کون ہو؟ مجھے منع کرنے والے! جاؤ، میں علیؓ کا بیٹا ابوبکر و عمر و عثمان، رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی مدح کرتا ہوں"۔

## باعظمت خاندان

آپ کے خاندان کی کئی شاخیں ہیں۔ آپ کے فرزند ارجمند سید ابوذر بخاری نے "سواطع الالہام" میں کچھ اشارات کیے ہیں جن سے بعض نامور ہستیوں کا سراغ ملتا ہے لیکن سلسلہ وار حالات ناپید ہیں مثلاً حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ جن کی ولایت دل و نگاہ کا آستانہ ہے، سید محمد شاہ بخاری جو سلطان مراد خان ثانی کے مرشد تھے، سید عبدالغفار بخاری جن سے سلطان زین العابدین والیٔ کشمیر بیعت تھے اس خاندان کے پیش رو ہیں لیکن جن بزرگ نے سب سے پہلے دہلی میں قدم رکھا، وہ سید اکمل الدین بخاری تھے جو حضرت شاہ غلام علی دہلوی سے بیعت تھے۔ آپ شاہ غلام علی سے خرقۂ خلافت لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں پنجاب کے ضلع گجرات موضع سرالی میں وارد ہوئے اور تادمِ زیست وہیں مقیم رہے ......!

شاہ جی کے دادا حضرت سید نورالدین احمد بخاری مرشد کی تلاش میں حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ کے آستانے پر پہنچے تو خواجہ سرو قد کھڑے ہو گئے چند دنوں مہمان رکھا، پھر پروانۂ خلافت اور سندِ ارشاد دے کر رخصت کیا۔

شاہ جی کے ایک دوسرے قرابت دار سید ہارون شاہ کا بیان ہے کہ ہمارے

بزرگ بخارا سے کشمیر پہنچے وہاں چند ماہ قیام کیا پھر پنجاب چلے گئے۔ یہاں سے بسلسلہ کاروبار دہلی اور پٹنہ کا رُخ کیا۔ دادا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں حیات تھے جب انگریزوں نے پنجاب فتح کیا تو آپ گجرات کے ایک گاؤں سرہالی میں آباد تھے، تمام علاقہ مُرید تھا لیکن فقر و استغنا کا یہ عالم تھا کہ کسی کی پھوٹی کوڑی کے روادار نہ تھے۔ خود کماتے اور کھاتے۔ انگریزوں نے زرعی نظام کی جدید تنظیم کے لیے زمینوں کی پیمائش کرائی، تو ایک اہل کار نے آپکے رُوحانی کمالات سے متاثر ہو کر عرض کی، آپ جتنی زمین چاہیں اس پر قبضہ کرلیں اندراجات میرے سپرد ہیں۔ آپ کے حسب منشا خانہ پُری ہو جائے گی لیکن آپ نے انکار کیا اور فرمایا:

"تمام زمینیں اللہ کی ملکیت ہیں ان پر ذاتی ملکیت کی اس طرح مُہریں لگانا شرعاً ناجائز ہے"۔

عام لوگوں نے خوب خوب فائدہ اُٹھایا۔ آپ کو ناگوار گزرا، سرہالی چھوڑ کر ایک دوسرے گاؤں ناگڑیاں چلے گئے۔ جہاں خاندان کے دُوسرے لوگ آج تک آباد ہیں۔

شاہ جی کی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابی، حکیم سید احمد اندرابی کی صاحبزادی تھیں۔ سید صاحب طبیہ کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل اور مختلف مُروّجہ علوم میں دسترس رکھتے تھے بالخصوص امورِ دین سے اُنھیں گہرا لگاؤ تھا۔ قدرت نے اُن کی آواز میں جادو کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔

شاہ جی کے والد سید ضیاء الدین احمد بخاری کا عنفوانِ شباب تھا۔ آپ پشمینہ بیچنے پٹنہ جاتے تو حکیم صاحب ہی کے ہاں ٹھہرتے تھے قرابت دار۔ وہاں سیدہ فاطمہ سے نکاح ہو گیا تو پٹنہ ہی میں رہنے لگے۔

**ولادت**

شاہ جی ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۱۰ ہجری (۱۸۹۱ عیسوی) کو جُمعہ کے دن نُور کے تڑکے پٹنہ میں پیدا ہُوئے۔ ابھی تین یا چار برس کا سن تھا کہ والدہ کا سایہ اُٹھ گیا۔

سیّد ضیاء الدّین نے بیٹے کو نانا نانی کے پاس چھوڑا اور خود اعزّہ کے بلاوے پر گجرات لوٹ گئے جہاں عقدِ ثانی کر لیا۔ دوسری اہلیہ سے بھی ایک ہی بیٹا ہے جو گجرات میں بزازی کی دُکان کرتا ہے۔ سیّدہ فاطمہ اندرابی کے دادا میر سیّد عبد السُّبحان کشمیر سے جا کر عظیم آباد پٹنہ میں بس گئے تھے۔ اُن کی بیٹی یعنی شاہ صاحب کی نانی حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرّہٗ کی نواسی تھیں۔

**خواجہ باقی باللہؒ**

حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا مرتبہ ہندوستان کے اہل اللہ میں بہت ہی بلند ہے۔ آپ نے کل اکتالیس برس کی عمر پائی لیکن اپنے پیچھے جو ورثہ چھوڑا، اس پر کئی صدیاں قُربان کی جا سکتی ہیں۔ آپ کابل میں پیدا ہُوئے۔ اصل نام رضی الدّین تھا لیکن باقی باللہ یا مُحمّد باقی باللہ کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کے والد قاضی عبد السلام خود اہلِ علم میں سے تھے۔ اُنھوں نے بیٹے کو بھی اسی ڈگر پر ڈالا، پہلے خود پڑھاتے رہے پھر مُلّا صادق حلوائی کے تلمذ میں دے دیا۔ مُلّا صاحب کابل چھوڑ کر ماوراالنّہر چلے گئے تو خواجہ بھی ہمراہ تھے۔ وہاں ایک مجذوب کی بدولت کتابوں سے ہاتھ اُٹھایا اور مُرشدِ راہ نما کی تلاش میں نکل گئے تب فقراء و مشائخ کے عروج کا زمانہ تھا، کچھ عرصہ ماوراالنّہر کے مشائخ کی صُحبت میں رہے مگر گوہرِ مقصود نہ پایا۔ اسی اثنا میں امیر عبد اللہ بلخی سے فیضان حاصل کیا اور طبیعت میں استقامت نے راہ پائی۔ مگر داخلی اضطراب جوش پر رہا۔ آخر ہندوستان پہنچے۔ یہاں کشمیر میں بابا بھائی کشمیری سے فیض حاصل کر رہے تھے کہ مرزا یادگار نے بابا صاحب

کو زہر دلوا کر مروا ڈالا، چار و ناچار دہلی کا قصد کیا۔ وہاں چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالعزیزؒ کی خانقاہ میں قیام فرمایا اور حضرت شیخ کے فرزند خواجہ قطب العالم سے رجوع کیا۔ ایک رات حضرتِ قطب العالم پر منکشف ہوا ــــــــ کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کو مشائخ بخارا بلاتے ہیں آپنے فوراً ہی انھیں مطلع کیا۔ اس وقت خرقہ موجود نہ تھا۔ ایک ازار بھی وہ دے کر روانہ کر دیا۔ خواجہ صاحب بخارا پہنچ کر خواجہ امکنگی کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے آپ کو محنت اور توجہ سے نقشبندی سلسلے کی تعلیم دی اور فرمایا کہ ہندوستان کو آپ کی ضرورت ہے وہاں جاؤ اور خلقِ خدا کو فیض یاب کرو۔ خواجہ سمرقند سے پشاور پہنچے۔ وہاں سے لاہور جہاں سال بھر قیام کیا اور دہلی چلے گئے وہاں فیروز شاہ کے قلعے میں مقیم ہوئے۔ اکبر کا آخری دور تھا اور آپ بھی کچھ زیادہ عمر لے کر نہ آئے تھے۔ آپنے فوراً ہی دربارِ اکبری کی بدعات روکنے کے لیے مفاہمانہ لیکن مضبوط اور مختلف قدم اٹھایا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ اہلِ دربار سے بگاڑ مناسب نہیں فی الحال ان سے تعلق پیدا کر کے ہی درباری گمراہیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے افسوس عمرنے وفا نہ کی چار یا پانچ سال کام کیا ہوگا کہ سفرِ آخرت پیش آگیا۔ لیکن اس مختصر سی مدّت میں بھی ملتِ اسلامیہ کو جو فیض پہنچا۔ اس کی نظیر پورے ہندوستان میں نہیں حضرت مجددؒ الف ثانی آپ ہی سے بیعت تھے۔ حضرت مجددؒ نے تاحینِ حیات آپ سے فیض حاصل کیا جس کا اعتراف انھوں نے اپنے مکاتیب میں بھی کیا ہے۔ بعض امرائے سلطنت بھی آپ کے مریدوں میں سے تھے جن سے سلسلۂ چشتیہ کو کماحقہٗ فائدہ پہنچا، مثلاً

۱۔ شیخ فریدالدین شہنشاہِ اکبر کے عہد میں ڈیڑھ ہزاری منصب سے دیوان تن کے عہدہ پر پہنچے۔ کئی مہمیں سر کیں جن میں افغانوں کی سرکوبی کشمیر کی فتح اور اسیر گڈھ کا محاصرہ نمایاں ہیں۔

جہانگیر کی تخت نشینی پر شیخ کا مرتبہ اور بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ تمام اعیان سلطنت میں بازی لے گئے صاحب سیف وقلم کا خطاب ملا۔ ڈیڑھ ہزاری سے پنج ہزاری ہو گئے۔ شہزادہ خسرو کو شکست دی، جہانگیر نے خوش ہو کر نواب مرتضیٰ خان کا خطاب بخشا اور گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا کوئی چار سال بعد پنجاب کا گورنر بنایا آخر اسی عہدے پر پٹھانکوٹ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وصیت کے مطابق دہلی میں دفن کیے گئے۔ آپ ان اکابر سلطنت میں سے تھے جن کی دریا دلانہ فیاضیاں اس زمانہ میں زبان زد عام تھیں اور جنھیں قدرت اقتدار کے ساتھ فقر بھی عطا کرتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی روایت سے لکھا ہے کہ شیخ فرید کے حقوق ہم سب پر ثابت اور مقرر ہیں کیونکہ اُن سے نقشبندی جمعیت کو استحکام حاصل ہے۔

۲۔ قلیچ خان حاکم پنجاب جس کی بیٹی سے اکبر کا بڑا بیٹا دانیال بیاہا تھا وہ ہر روز گھنٹہ بھر فقہ و تفسیر کا کھلا درس دیتا۔ اہل لاہور اس کی وسعت نظر اور فراخ دلی کے گرویدہ تھے

۳۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں جو بیرم خاں کے بڑھاپے میں بمقام لاہور پیدا ہوا۔ اس کی علم دوستیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔

۴۔ مرزا حسام الدین جن کے والد کی بابت بدایونی نے لکھا ہے کہ دربار اکبری میں سجدۂ زمین بوسی کا بانی تھا۔ حسام شیخ مبارک کا داماد اور ابوالفضل و فیضی کا بہنوئی تھا۔ اُس کو باپ کی وفات پر موروثی منصب ملا۔ خانخاناں کی معیت میں دکن کی مہم پر گیا، کہ ایکا ایکی تارک الدنیا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ خانخاناں نے بہتیرا روکا لیکن دیوانہ ہو کر گلی کوچوں میں گھومنے لگا، کچھ دنوں بعد دہلی کا قصد کیا وہاں خواجہ باقی باللہؒ سے بیعت کی جب حضرت خواجہ اللہ کو پیارے ہو رہے تھے تو مرزا آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضرت خواجہ کے دونوں بیٹے خواجہ کلاں اور خواجہ خورد آپ کی وصیت کے مطابق حضرت مجدد الف ثانیؒ

کے حلقۂ رشد میں تھے لیکن اُن کی عام خبرگیری کے فرائض مرزا حسام الدین کے سپرد تھے۔ انھی خواجہ خورد سے شاہ ولی اللہؒ کے والد شیخ عبدالرحیمؒ نے چند سبق پڑھے اور فیض حاصل کیا تھا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پوتے شیخ عبدالنبیؒ صدر الصدور بھی حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔

شیخ قطب عالم کے ذکر میں آچکا ہے کہ اُن کے والد حضرت شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں حضرت خواجہ نے کچھ دن گزارے اور شیخ قطب عالم سے استفادہ فرمایا تھا۔ انھی شیخ قطب عالم کے فرزند شیخ رفیع الدین کا دہلی سے باہر اعظم پور میں نکاح تھا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ حضرت خواجہ شریک ہوں۔ آپ نے ضعف و علالت کے باعث معذرت چاہی۔ شیخ نہ مانے کہنے لگے، "آپ نہیں آتے تو میں شادی نہیں کرونگا۔" راضی ہوگئے، نکاح پڑھایا۔ اس زوجہ سے شیخ رفیع الدین کے ہاں جو بیٹی پیدا ہوئی اسے شاہ ولی اللہ جیسا یگانۂ عصر پوتا عطا ہُوا ----

شاہ جی فرماتے ہیں کہ خون نسلاً بعد نسلٍ برتتا ہے بعض خصائص قُدرتِ کاملہ کی طرف سے اہل اللہ کی اولاد کو جزءًا یا کلاًّ ضرور ودیعت ہوتے ہیں۔ اس مادّی دُنیا میں رُوحانی تصرفات کی یہ باتیں بہ ظاہر عجیب و غریب نظر آتی ہیں لیکن بہرحال اس کے آثار و مظاہر موجُود ہیں شاہ جی اور اُن کے بزرگوں کی زندگی میں بعض باتیں آج بھی ایک گونہ مماثلت رکھتی ہیں مثلاً خواجہ باقی باللہؒ نے ہندوستان میں پہلے پہل جن بزرگ سے تعلق پیدا کیا۔ وُہ

۱۔ خواجہ عبیدُاللہ احرارؒ تھے۔ آپ نے سلسلۂ الاحرار کے نام سے رُباعیات بھی لکھی ہیں جن میں سے ایک رُباعی یہ ہے:

این سکہ کہ من زدم بنامِ فقر است
دین روشنی از نورِ تمامِ فقر است
برخیز و رہِ خواجۂ احرار بگیر
کان راہ زسر حدِ مقامِ فقر است

شاہ جی سراپا احرار ہیں اور احرار اُن کی تمام زندگی کے برگ و بار۔

۲- خواجہ باقی باللہؒ جی جان سے علومِ مُتداول حاصل کر رہے تھے کہ ایک مجذوب صدا دیتا ہُوا گزر گیا :

در کنز و ہدایہ نتواں دید خدا را
آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

خواجہؒ نے کتابوں کو طاق پر رکھا اور کتابِ دل سے معاملہ کر لیا۔ حضرت شاہ صاحب بھی کسی باقاعدہ مدرسہ کے طالب علم نہیں اور نہ علومِ متداولہ میں سند یافتہ ہیں لیکن "آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست" سے بہرہ ضرور وافر پایا ہے۔

۳- حضرت خواجہؒ نے مُرشد کے ارشاد پر لاہور میں سال بھر قیام کیا اور ہمیشہ خُلفا پر زور دیتے رہے کہ پنجاب میں ارشاد و ہدایت کا بیڑا اٹھائیں چنانچہ حضرت مُجدّد الف ثانیؒ کو اوّل اوّل لاہور ہی کے لیے نامزد فرمایا جو آپ کے وصال تک لاہور ہی میں مقیم تھے۔

شاہ جی نے بھی تبلیغ کی ساری عُمر پنجاب میں گزار دی۔ حضرت علامہ انور شاہ رحمۃُ اللہ علیہ اور پانچ سو عُلمانے انجمن خُدّام الدّین کے سالانہ جلسہ منعقدہ لاہور میں آپ سے بیعت کی اسی جلسہ میں آپ کو امیرِ شریعت منتخب کیا گیا۔

حضرت خواجہؒ نے اپنے ملفوظات میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ذکر کر کے لکھا ہے :

"اگر سخن (وعظ) کا اتفاق ہو تو بہ طور علما کے کہنا، بطور صوفیا کے نہیں"

شاہ جی کی ساری زندگی اسی کا آئینہ ہے۔ وہ علم و تصوف کا ایک سیاسی مرقع ہیں۔ ان میں حضور سے غیب، عین سے علم اور شہود سے استدلال کی رنگا رنگی پائی جاتی ہے لیکن ان کے ہاں سلوک و طریقت کی وہ منزلیں عنقا ہیں جن سے مشیخت پروان چڑھتی ہے خواجہ (نوّر اللہ مرقدہٗ) کا مقولہ ہے کہ حاصلِ سلوک تہذیب الاخلاق ہے۔ شاہ جی اسلاً اس قول کا عکس ہیں۔ فرق یہ ہے کہ زمانۂ سابق میں مشائخ و علما کے حدود و فرائض اب سے مختلف تھے۔ پہلے اصلاح احوال مقصود تھا۔ آج انقلابِ احوال مقصود ہے۔

غرض ہر دور میں اس خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد فقر و استغنا میں ممتاز رہا اور حسبِ توفیق فکر و نظر کی لادینی کے خلاف جہاد کرتا رہا۔

### تعلیم و تربیت

شاہ جی کسی معروف مدرسہ کے فارغ التحصیل نہیں بلکہ اُن لوگوں میں سے ہیں۔ جن کی تربیت مبدءِ فیاض سے ہوتی ہے۔ ابو ذر بخاری نے "سراطع الالہام" کے تعارف میں تعلیم کے اس پہلو کو تشنہ رکھا اور کوشش کی ہے کہ الفاظ سے کھیلتے ہوئے نکل جائیں حالانکہ اس ضمن میں بعض باتیں بالکل صاف تھیں مثلاً :

۱. شاہ جی چھٹپنے ہی میں والدہ سے محروم ہوگئے اور والد پٹنہ ترک کرکے گجرات چلے گئے تھے۔ نانا اور نانی نے مرحومہ بیٹی کی نشانی سمجھ کر پالا پوسا اور گھر ہی میں پڑھایا۔

۲. جس خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ وہ انگریزی مدرسوں کے تصور ہی سے بیزار تھا، لہٰذا ایسے کسی مدرسہ میں داخلہ کا سوال خارج از امکان تھا۔

۳. پھر اس زمانہ میں شرفا کے بچے گھروں میں تعلیم حاصل کرتے اور بڑی بوڑھیوں سے زبان و محاورہ سیکھتے تھے۔ شاہ جی نے نانا مرحوم سے فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں

نانی مرحومہ سے اردو بول چال میں صحت پیدا کی۔ شاد عظیم آبادی کی شہرت کا آغاز تھا ان کے آپ کے خاندان سے ذاتی مراسم تھے وہ زبان و محاورہ کی سند و تحقیق کے لیے شاہ جی کی نانی اماں سے مشورہ کرتے اور آپ حضرتِ شاد کی صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ آپ (شاہ جی) چھوٹی عمر ہی میں پختہ ہو گئے۔ دماغ چمک اٹھا، زبان منجھ گئی اور ذہانت و ذکاوت کے فطری انعام نے طبیعت میں چار چاند لگا دیے۔

جب یہ صحبتیں درہم برہم ہو گئیں اور شاہ جی نے بلوغ کی طرف قدم رکھا۔ تو نانا اور نانی کی رحلت کے بعد پنجاب کا قصد کیا۔ آپ کو اس سفر میں مصیبتیں بھی پیش آئیں چنانچہ دوران سفر میں کئی جگہ روزی کے لیے رکنا پڑا۔ بنارس میں چاندی کے ورق کوٹتے رہے آخر پھرتے پھراتے امرتسر پہنچے وہاں الحاج مولانا نور احمدؒ سے قرآن کی تفسیر پڑھی، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ سے فقہ اور حضرت مفتی محمد حسن صاحب سے علم حدیث لیکن طبیعت میں عام نابغہ لوگوں کی طرح ٹکاؤ نہ تھا۔ کبھی پڑھ لیا، کبھی چھوڑ دیا۔ ایک چھوٹی سی مقامی مسجد میں امام ہو گئے، تھے خوش الحان، رفتہ رفتہ وعظ کہنے لگے۔ امرتسر کا عمومی مزاج شروع سے دینی تھا لیکن بدعات عام طبیعتوں میں راسخ ہو چکے تھے۔ آپ نے اصلاح رسوم کی ٹھانی اور گلی گلی پھر گئے چند دنوں ہی میں دھاک بندھ گئی، بالکل نوجوان تھے، خوبرو وجیہ، نستعلیق، طلاقت گفتار سونے پر سہاگہ، تمام امرتسر عش عش کر اٹھا:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

## سیاست میں شرکت

پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کو فتح ہوئی تو ہندوستان کو انعام میں رولٹ ایکٹ ملا۔ ملک میں عام غم و غصہ کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آگیا جس نے ملک کو انگاروں

لوٹا دیا مسلمانوں میں تحریک خلافت نے راہ پائی۔ مولانا داؤد غزنوی نے بڑی جرأت سے کام لیا اور امرتسر میں ان مظالم کے خلاف احتجاج کی بنا ڈالی۔

شاہ جی کا ذہن "الہلال" کے بالاستیعاب مطالعہ سے پہلے ہی پلٹ چکا تھا۔ مولانا داؤد غزنوی کی ترغیب پر شریک احتجاج ہو کر آن واحد میں سیاسی خطیب ہو گئے۔ حتیٰ کہ اس سرے سے اس سرے تک آپ کا طوطی بولنے لگا۔ بس پھر کیا تھا، ملک کے ہر گوشہ سے دعوت آنے لگی۔ تحریک لاتعاون نے زور پکڑا تو ہندوستان کا کونا کونا چھان مارا۔ جہاں گئے، جوش و تنظیم یکجا ہو گئے بالخصوص صوبہ متحدہ کے شمالی اضلاع دہلی اور ملحقہ علاقے، پنجاب کے شمال مغربی حصّے اور صوبہ سرحد کے بعض شہر آپ کی للکار سے گرج اُٹھے یہ گویا آپ کی سیاسی زندگی کا سر آغاز تھا جس نے آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا خطیب بنا دیا۔ تب سے اب تک آپ کی زندگی ایک مسلسل سفر ہے۔ جس کی تفصیلات آپ آئندہ ابواب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

### تصوّف سے دلچسپی

شاہ جی کو تصوّف سے مناسبت ضرور ہے لیکن نہ تو وہ روایتی صُوفی ہیں، نہ روایتی وہابی۔ ان دونوں کے بین بین ہیں۔

اُنھیں قادری، چشتی، نقشبندی سلسلوں سے باطنی ربط سا ہے، مگر وہ تصوّف کو اسلام سے کوئی مختلف چیز نہیں سمجھتے جیسا کہ بعض صُوفیوں کی ذہنی اختراعات سے منعکس ہوتا ہے وہ اصلاً اس کو "احسان" سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک "احسان" ایک ایسی عبادت ہے گویا خدا تم کو دیکھ رہا ہے یا تمھارا یہ سمجھنا کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ نظر کا یہ فیضان کتابوں سے نہیں بلکہ بزرگوں کی صحبت اور ان کی توجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ شاہ جی ان معنوں میں ضرور صُوفی ہیں کہ وہ جن چیزوں کو

معروفات کے تحت مانتے ہیں اُن کے نزدیک وُہ علم الیقین اور عین الیقین ہی نہیں بلکہ حق الیقین کا درجہ رکھتی ہیں اُن کا عقیدہ ہے کہ تصوّف، وجدان کی تنقیح کرتا ہے اور علم سے وسعتِ فکر پیدا ہوتی ہے اس بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ امام مالکؒ کا ہے جو شخص شخص صُوفی ہُوا اور فقیہ نہ ہُوا وہ گمراہ ہُوا اور جو فقیہ ہُوا اور صُوفی نہ ہُوا، وُہ فاسق رہا اور جس نے ان دونوں کو جمع کیا وہ محقّق ہو گیا۔

الغرض ان کے نزدیک باطنی شعور کے تصفیہ و اِرتقا کا نام تصوّف ہے جس تصوّف سے سکنت پیدا ہو یا توجّہ الی اللہ خلقِ خدا سے کنارہ کشی پر منتج ہو وُہ اس سے سخت بیزار ہیں اُنھوں نے عنفوانِ شباب میں سلوک و طریقت کی کچھ منزلیں طے کیں۔ تزکیۂ نفس کے لیے دو دو سال تک متواتر روزے رکھے۔ چھ چھ گھنٹے میں قرآن مجید ختم کیا۔ ستاروں سے بازی بدی تو انھیں ہرا دیا۔ کئی کئی روز پانی میں نمک ملا کر جَو کے ستوؤں پر بسر کی۔ تنور کی روٹی کے خستہ ٹکڑوں پر گزارا کیا۔ غرض اس ریاضت کا نتیجہ یہ نکلا کہ قسامِ ازل نے خطابت کا جو سحر آپ میں ودیعت کیا تھا، تلوار کی طرح صیقل ہو گیا۔

**تحریکِ قبہ شکنی**

ابنِ سعُود نے اسلاف کی قبروں کو مسمار کرنا شروع کیا تو ہندوستانی مُسلمانوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ اس ہیجان کے محرکات میں برطانوی حکومت کا کھلا ہاتھ تھا اکثر لوگ مذہباً قبہ شکنی کے خلاف تھے۔ لیکن ایک بڑا عنصر محض" استادِ ازل" کے اشارۂ ابرو پر مشتعل ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے ان لوگوں کا ساتھ دیا جو ابنِ سعُود کے حق میں تھے۔ اس ہمنوائی پر اُن کے خلاف یہ بات شد و مد سے کہی گئی اور یار لوگوں نے فتویٰ بھی جڑ دیا کہ وہابی ہیں لیکن آپ جس جذبے سے ابنِ سعُود کی حمایت کر رہے تھے وہ سراسر انگریز دشمنی کا جذبہ تھا۔ آپ نے عقائد کی بحث کو ثانوی درجہ میں رکھا اور جو لوگ ابنِ سعُود کے خلاف ژاژ خائی پر تلے بیٹھے

تھے، ان سے بے دریغ بھڑ گئے

ظاہر ہے کہ تحریک خلافت کے طوفان نے انگریزی حکومت کو اس اعتبار سے سخت ہراساں کیا تھا کہ ہندوستانی مختلف العقیدہ ہونے کے باوصف اس احتجاج میں ایک ہو گئے تھے۔ جب تحریک ختم ہو گئی تو برطانوی کارندوں نے اس شیرازے کو منتشر کرنے کے لیے سیاسی شبخون مارنا شروع کیا۔ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں بھڑایا گیا پھر مجلس خلافت دو حصوں میں بٹ گئی۔ انگریزوں کو اسلامی ملکوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی دابستگی کا جو تجربہ تحریک خلافت میں ہُوا، اس سے انھیں ایک نیا سبق ملا تھا۔ چنانچہ شریف مکہ کے طرزِ عمل سے ہندوستانی مسلمانوں میں اس کے خلاف جو نفرت انگیز جذبات پیدا ہو گئے اور جن کی بالواسطہ زد میں خود انگریز آتے تھے، اُن جذبات کو برطانوی نمک خواروں نے نہ صرف ابنِ سعُود کی قبہ شکنی کے خلاف استعمال کیا بلکہ خلافتی راہنماؤں میں پھوٹ کے آثار پا کر انھیں اور تیز کیا۔ شاہ جی نے اس چال کی سخت مزاحمت کی۔ اس پر علمائے بدعت کی بارگاہ سے آپ کے خلاف فتوے صادر ہونے لگے۔ کہیں کافر کہا گیا، کہیں وہابی لیکن آپ نے ان فتوؤں کو خندہ زیرلبی ہی میں ٹال دیا۔

## ذاتی عقیدہ

شاہ جی حنفی العقیدہ لیکن بدعات کے سخت خلاف ہیں۔ آغاز میں حضرت سیّد مہر علی شاہ گولڑہ شریف سے بیعت تھے۔ اب حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت ہیں۔ آپ کو ہر بزرگ دین سے شیفتگی ہے خواجہ معین الدّین چشتیؒ حضرت نظام الدّین اولیاءؒ اللہ، حضرت بابا فرید الدّین گنج شکرؒ اور دُوسرے اہل اللہ سے درویشانہ خصُوصیت رکھتے ہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے شیدائی اور شاہ ولی اللہؒ کے فدائی ہیں۔

غرضیکہ آپ کے جذبات میں ایک عجیب و غریب تکرار ہے وُہ فقر و سیاست کا ایک ایسا سرچشمہ ہیں جس سے کئی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ فقیروں میں فقیر، ملنگوں میں ملنگ، درویشوں میں

درویش، عالموں میں عالم، سیاست دانوں میں سیاست دان، قائدوں میں قائد ؏

شاید کہ تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

آپ کی محفل آرائیاں، سینکڑوں مرتّب و غیر مرتّب کتابوں کا خلاصہ ہوتی ہیں۔ آپ کے ہاں کسی شخص کے لیے کوئی روک نہیں ایک کھلا دروازہ ہے جس میں ایک جام بدست رند سے لے کر ایک عمامہ بر سرِ زاہد تک اور ایک کفن بر دوش مجاہد سے لے کر ایک شاہد بکنار شاعر تک، بلاتکلف داخل ہو سکتے ہیں۔ آپ کو تنہائی سے سخت نفرت ہے اور جانتے ہیں کہ جہاں تنہائی ختم ہوتی ہے وہاں سے بازار شروع ہوتا ہے پھر بازار کی زندگی سراسر روگ ہے۔ مگر اس روگ پر آپ نے اپنی زندگی بادۂ صافی کی طرح لٹائی ہے ——

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود

زِ زُہدِ ہمچو تُرے یا زِ فسقِ ہمچو منے

## اٹکاؤ اور لگاؤ

آپ کی سب سے بڑی کمزوری (WEEKNESS) حسن ہے۔ حسن کے معاملے میں آپ "دل پھینک" واقع ہوئے ہیں یہاں آپ کا مسلک بو علی قلندرؒ کا مسلک ہے۔ حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، پہاڑوں پہ ہو یا میدانوں میں غرضیکہ فطری حسن سے آپ کو والہانہ لگاؤ ہے۔ خود فرماتے ہیں:

باغ و بہارِ ما ندیم یعنی کہ جنّت النّعیم

روئے خوش است خمّے خوش بوئے خوش و گلوئے خوش

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم و مغفور آزادیٔ ہندوستان تک آپ کے رفیق رہے۔ ان سے جو خصوصیت رہی، واقفانِ حال سے پوشیدہ نہیں اکثر کہا کرتے تھے، میں مُلّا شاہ ہوں اور حبیب الرحمٰن عنایت ارائیں —— لیکن پیر و مرید

دونوں ایک دوسرے کی ضد، وہ جلالی، یہ جمالی۔ جلالی نے جمالی کو ٹوکا۔ شاہ صاحب!
کیا بزم جما رکھی ہے، فضول، بے معنی، لغو۔ مگر شاہ جی فضول، بے معنی، لغو پر ریجھ چکے تھے۔
اب آپ انھیں لاکھ کہیے، قبلہ جلسہ گاہ میں ہزاروں لوگ امیر شریعت کی راہ دیکھ رہے ہیں
لیکن امیر شریعت گرد و پیش کے حسن پر نقد و نظر فرما رہے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ آپ
کے نقد و نظر کی زبان غالب سے لے کر نظیری تک اور میر سے لے کر عرفی تک سے مستعار
ہوتی ہے ان مواقع پر آپ خود آوازبن جاتے ہیں اور قدرے کھل جائیں تو عربی شعرا کا بھرپور
کلام سنانے لگتے ہیں، کسی مصرع کی شرح کر دی، کسی مصرع پر چپ سادھ لی۔ بسا اوقات اچھے
چہروں سے موضوع ڈھونڈ لیتے اور قرآن و حدیث سے استنباط کرتے ہیں۔

التمسوا الخیر فی حسانِ الوجوہ (الحدیث)

اچھے چہروں میں بھلائی کی جستجو کرو ——!

اس ضمن میں ان کی معلومات حد درجہ وسیع ہیں۔ خود خوش آواز ہیں اگرچہ عمر کے بہاؤ
میں آواز کا رسیلا پن کسی قدر بہ گیا ہے لیکن لگاؤ اور کھٹک جوں کی توں ہے۔ گو خوشبو پر
مرتے لیکن اچھی آواز پر جی جان سے مرتے ہیں۔ کوئی خوش الحان قاری مل جائے تو پہروں
قرآن سنتے اور مغنی ہو تو شعر و شاعری میں جہاں تک بس چلے ڈوب جاتے ہیں۔

### شاعری کا شوق

ایک خطیب معناً شاعر ہوتا ہے اور آپ کو تو شعر گوئی کا ملکہ بھی
ہے۔ ندیم تخلص فرماتے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے نے آپ
کے شعروں کا مجموعہ "سواطع الالہام" کے نام سے شائع کیا ہے۔ جس کے تعارف سے معلوم ہوتا
ہے کہ شعر گوئی کا ذوق شروع میں تونا مرحوم اور شاد عظیم آبادی کی صحبتوں سے پیدا ہوا، لیکن
امرتسر میں مولانا محمد دین غریب سے تلمذ اختیار کیا مگر ذوق ایک آدھ شعر سے آگے نہ بڑھا۔ تحریک

خلافت میں قید ہوئے تو میانوالی جیل میں ملکہ شعر سوا ہو گیا۔ مولانا عبدالمجید سالک بھی قید میں تھے
اُن سے مشورۂ سخن شروع کیا۔ آج کل حضرت طالوت سے استفادہ فرماتے ہیں آپ کوئی باقاعدہ
شاعر نہیں اور نہ آپ کے شعر باقاعدہ ہیں بس جذبات کا ایک اُبال ہے البتہ دو چار نعتیں ایسی ضرور
ہیں جن میں شعری بانکپن جھلکتا ہے۔ طبیعت کی موزونی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ساحر لدھیانوی
نے قحطِ بنگال پر جو نظم لکھی تھی۔ اس میں ایک بند کا دُوسرا شعر نہیں ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے نظم پڑھی۔
تعریف کی۔ ساحر سے کہا :

"اس کا صلہ چند آنسو ہیں یہ لو۔ اور یہ دُوسرا شعر تمھاری نذر ہے"

ساحر کا شعر ہے :

ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دُخترانِ وطن تار تار کو ترسیں!

شاہ جی نے ایزاد کیا :

چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اُس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

**مطالعہ**

شاہ جی اصطلاحاً کتابی نہیں ابتدائی مطالعہ ہی سے سیر ہیں۔ آپ کے غور و فکر کا
اصل محور قرآن مجید ہے۔ جب کبھی تنہا ہوتے، پڑھتے، سوچتے اور سر دُھنتے
ہیں۔ کوئی اچھی کتاب بالخصوص دینیات یا اسلامیات پر مل جائے تو بڑے انہماک سے پڑھ
لیتے ہیں تاریخ سے ایک گونہ دل چسپی ہے لیکن سیاسی تاریخ سے کلام ہر شاعر کا پڑھ لیتے اور
اس کی داد بھی دیتے ہیں کوئی باقاعدہ لائبریری نہیں امرتسر میں بعض نادر کتابیں اسلامیات پر
جمع کی تھیں جن میں "الہلال" کے فائل بھی تھے مگر امرتسر لٹا تو وہ بھی غارت ہو گئیں۔ میرزائیت

کے لٹریچر کو اپنی تبلیغی مُہم کے لیے انتقادی نقطہ نگاہ سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اخبار مستقلاً پڑھتے ہیں بعض اخبارات کو ہاتھ تک نہیں لگاتے کیونکہ ان پرچوں کے بجائے ان کے پرچہ نویسوں کو پڑھ چکے ہیں۔ جدید لٹریچر سے انھیں کوئی واسطہ نہیں بالخصوص کہانی، ناول، افسانہ آپ نے کبھی نہیں پڑھے جدید شاعری میں نظمِ آزاد اور نظمِ معرّیٰ کو نہ صرف مضحک خیال کرتے ہیں بلکہ بعض معرّیٰ شاعروں کی پیروڈی بھی کی ہے۔ جس کتاب کو اپنے نقطۂ نگاہ سے مفید سمجھیں۔ اس کے لیے اشتہار بن جاتے ہیں۔ ایک زمانہ میں "مسلمانوں کا روشن مستقبل" نامی کتاب کا مطالعہ آپ نے ہر سیاسی کارکن پر فرض کر دیا تھا۔ مدّتوں علاّمہ اقبال کا کلام سا تھ رکھا۔ لیکن آپ کا کتابی مطالعہ تھوڑا اور انسانی زیادہ ہے۔ فرماتے ہیں: جس زمانہ میں پڑھتا تھا تو شب و روز پڑھتا تھا۔ اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بہت سی کتابوں کے پڑھنے سے چند کام کی کتابیں پڑھ لینا بہتر ہے۔

## تفریحات

شاہ جی کو کسی کھیل سے کوئی رغبت نہیں بلکہ تفریحات میں لکیر کو رہے ہیں کبھی موج میں ہوں تو گفتگو کے بہاؤ میں بعض باتیں کہ جاتے ہیں۔ مثلاً بچپنے میں پتنگ بازی کا شوق تھا اور گڈّی کے کاغذ سے لے کر ڈور تک کی نسل سے باخبر تھے۔

ایک زمانہ میں کبوتر پالنے کا بھی شوق تھا اور امرتسر میں تو کبوتروں کی ٹکڑی رکھتے تھے ہر کبوتر کا حسب نسب، رنگ روغن اور چال ڈھال جانتے ہیں ——— ع

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گولے اور گرہ باز اُڑن کبوتروں میں جواب نہیں رکھتے۔ گرہ باز کابل سے لائے گئے۔ گولے عربی نسل سے ہیں لیکن ہندوستان میں ترکستان اور

ایران سے درآمد کیے گئے تھے۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک وقت میں دو سو کی ٹکڑی بنا کر اڑ سکتے ہیں۔ گرہ باز دس بارہ کی ٹکڑی سے زائد میں نہیں اُڑتے لیکن صبح سے شام تک اُڑتے ہیں۔ اپنے آقا اور اڈے کو کبھی نہیں بھولتے۔ جن کبوتروں کو خوش رنگی اور خوب صورتی میں شہرت حاصل ہے۔ ان میں شیرازی، گلی، نسادری، گلوے، لقے، لوٹن، چوپا چندن اور یاہو، فقراو مشائخ کو عزیز ہیں۔ مؤخر الذکر عموماً اہل اللہ کے مزاروں پر رہتے ہیں۔ بٹیر بازی کو شاہ جی شرفا کا کھیل نہیں سمجھتے۔ مگر ان کی دو قسموں گھاگس اور جنگ کو برطانوی نمک خواروں کے خلاف پھبتی کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں شطرنج کھیلنے کا شوق تھا جو رفتہ رفتہ محو ہو گیا۔ جوان تھے تو مگدر ہلاتے اور بنوٹ کھیلتے تھے جیل خانے میں بیڈمنٹن سیکھی لیکن اب ہر کھیل سے جی بھر چکا ہے۔ صرف مرغ پالنے کا شوق باقی ہے۔ آٹے کی گولیاں بناتے اور مرغوں کو کھلاتے ہیں۔ اصیل مرغ کے بڑے قدردان ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ عربی نسل سے ہے۔ میدان میں جم کر لڑتا ہے۔ کوئی جانور اس سے بڑھ کر بہادر نہیں۔ مر جاتا ہے لیکن میدان سے منہ نہیں موڑتا۔

## لباس و خوراک

تمام عمر موٹا جھوٹا پہنا۔ کھدر کبھی ترک نہیں کیا۔ پہلے شلوار کرتہ پہنتے اور سر پر رنگ دار تولیہ کی خود ساختہ ٹوپی اوڑھتے تھے اب شلوار کی جگہ تہبند نے لے لی ہے۔ کرتہ یا قمیص جس کے اندر ترچھی جیبیں ہوتی ہیں، عموماً خاکستری پہنتے ہیں۔ ایک زمانہ میں سرخ قمیص پہنا کرتے تھے۔ بعض شرعی گوشوں نے لب بستہ اعتراض کیا تو فرمایا قصہ خوانی بازار (پشاور) کے شہیدوں کی یاد میں قمیص سرخ کر لی ہے۔ احرار رضا کاروں کی وردی کا رنگ بھی انہی کے خون کی یاد میں سرخ تھا۔

خوراک عموماً سادہ کھاتے ہیں محلوں سے لے کر جھونپڑوں تک میں کھانا کھایا مگر کبھی
چیز سے کوئی رغبت نہیں رکھی۔ دال بھات جو ملے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ایک وقت میں
کئی کھانوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس ایک سالن، اُس کے ساتھ روٹی یا چاول، میٹھا ملا
کھا لیا۔ نہیں تو شکر پھانک لی، خوراک زیادہ نہیں کھاتے لیکن سیر ہو کر کھاتے اور دو وقت کھاتے
ہیں۔ چائے گھٹی میں پڑی ہے ہمیشہ نفیس چائے پیتے اور اکثر خود بنا کر پیتے ہیں کبھی کیتلی اور تمام چینی
کا آب خورہ ساتھ رکھتے تھے۔ آپ کے نزدیک ہر شخص چائے بنانے اور چائے پینے کا اہل نہیں
اس کے لیے سلیقہ چاہیے۔ عام لوگ چائے نہیں جوشاندہ پیتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح
انھیں بھی چائے کی کہانی یاد ہے۔ طبیعت حاضر ہو تو مزے سے بیان کرتے ہیں۔ پان شروع
سے کھاتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا پاندان ساتھ رکھتے، چھالیا خود کاٹتے، چونا خود بناتے اور کتھا
خود پکاتے ہیں اس پان خوری میں دانت بھی گھلا دیے ہیں۔

## عادات و خصائل

کبھی کسی دوست کی غیبت نہیں کرتے نہ کسی دوست کی غیبت
سنتے ہیں جو لوگ ان سے شدید اختلاف رکھتے ہوں مگر مخلص ہوں ان
کی جی جان سے عزت کرتے اور آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ آپ کے ذاتی دوستوں میں کئی ایسے ہیں جن
کی سیاسی راہیں مختلف تھیں مثلاً تاثیر مرحوم سے ایک گونہ تعلق خاطر تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک، سید
احمد شاہ بخاری (پطرس) اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے سالہا سال کی دوستی ہے۔ ایک
دفعہ جن لوگوں کو پرکھ لیا، پرکھ لیا۔ پسند و ناپسند دونوں میں سخت ہیں۔ ہر شخص سے متعلق نپی
تُلی رائے ہوتی ہے۔ ہندوستان میں کوئی سیاسی یا شرعی رہنما ایسا نہیں جن سے آپ کے
مراسم نہ رہے ہوں ہر ایک کے بارے میں آپ کی دو ٹوک رائے ہے اگر کسی کے خلاف
رائے قائم ہو گئی ہے تو اس میں کینہ یا بغض نام کو نہیں ہوگا اور نہ ذاتی بنیادوں پر کسی سے

منتقم ہوتے ہیں جن رفقا پر اعتماد ہو اُن کی غلطیوں پہ دامن ڈال دیتے جن دوستوں میں عمر بسر کی ہے انھیں جی جان سے چاہتے ہیں اگر اُن سے کبھی کوئی شکایت پیدا ہو تو مسکرا کر ٹال جاتے ہیں۔ بعض بڑی ہستیوں کے متعلق آپ کی عجیب و غریب رائے ہے : گاندھی جی کو مہاتما کم اور سیاست دان زیادہ سمجھتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور سی آر داس کو سچا نیشنلسٹ، مالویہ جی اور ولبھ بھائی پٹیل کو پکا ہندو۔ مولانا ابو الکلام آزاد کو علم کا سمندر، پنڈت جواہر لال نہرو کو سیاسی طوفان، مولانا حسین احمد مدنی کو متحرک تقویٰ اور مفتی کفایت اللہ مرحوم کو دورِ حاضر کا ابو حنیفہ۔ علامہ اقبالؒ سے تا زیست دلی تعلق رہا جب کبھی اُن کے ہاں جاتے تو حضرت علامہ تپاک سے ملتے، فرماتے :

"شاہ جی فلاں بات ہو گئی ہے"!

کونسی بات ؟

"شاہ جی بس ہو گئی ہے۔ آپ سے بیان کیا تو آپ دہلی دروازہ کے باغ میں ڈونڈی پیٹ دو گے، اچھا سُنیے، ایک تازہ نظم ہوئی ہے"۔

حضرت سُناتے، شاہ جی سُنتے اور جھومتے۔ چودھری افضل حق مرحوم کو احرار کے مہاتما کا لقب دے رکھا تھا۔

"کہو مہاتما جی، ہمارے لیے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے"؟

مولانا حبیب الرحمٰن کو عنایت ارائیں کہتے اور خود کو شاہ بنتے۔ میاں قمر الدین مرحوم احرار کے بلا تھے انھیں اپنا چلتا پھرتا بنک کہ کر پکارتے شیخ حسام الدین کو دیدہ دل مولانا مظہر علی کو یا غلط لقافی احسان اللہ کو بٹیا۔ اب جماعت کے جن ساتھیوں سے انھیں لگاؤ ہے اُن میں مولانا محمد علی جالندھری، مولانا تاج محمود لائل پوری اور مجاہد الحسینی کو دل سے قریب سمجھتے ہیں۔

## ڈنڈے والا پیر

پنجاب کے دیہات میں آپ کا نام "ڈنڈے والا پیر" مشہور رہا۔ احرار رضاکار کلہاڑی رکھنے لگے تو آپ نے بھی اُٹھالی کئی سال تلوار لیے پھرے۔ آج کل پھر ڈنڈا رکھتے ہیں۔

## خط و کتابت

لکھنے کا شوق نہیں البتہ خطوط کا جواب سفر و حضر دونوں صورتوں میں خود لکھتے ہیں غیر ضروری خط و کتابت سے اجتناب کرتے ہیں کسی کو تہدیہ یا تعزیت کا خط نہیں لکھتے، کوئی عزیز رحلت کر گیا تو گھر میں بیٹھ کر افسوس کر لیا، کسی دوست کے ہاں خوشی ہوئی تو دعا فرما دی۔

## مجموعۂ صفات

زندگی بھر مسائل مختلفہ پر قرآن مجید کی آیتیں حضور سرور کائنات کی حدیثیں اور آئمہ کبار کے حالات اکھٹے کیے ہیں ہزاروں شعر نوک زباں ہیں لطیفہ بازی اور برجستہ گوئی میں اتنے مشاق ہیں کہ سارے برصغیر میں ان کی ٹکر کا ایک آدمی نہیں ہر علاقہ کے عادات و اخلاق اور زبان و کلام سے اس تبحر کے ساتھ واقف ہیں کہ آپ کو پاکستانی زبانوں کا چلتا پھرتا لغت کہا جائے تو بے جا نہیں۔ سب سے بڑا کمال آپ کی بے نیازی ہے۔ خوف آپ کی جمڑی میں نہیں۔ کبھی آنکھ اٹھا کر بھی کسی کے روپے کی طرف نہیں دیکھا۔ آپکے ذاتی مریدوں میں رنگا رنگ کے لوگ شامل ہیں بالخصوص ایسے لوگ جو آپ کی سیاست سے ہمیشہ ہی گریزاں رہے۔ بہت سے لوگ آپ کو پیروں بلکہ قبروں کی طرح پوجتے ہیں پنجاب میں جتنے شخصی جاں نثار آپ نے پیدا کیے اتنے کسی اور گروہ جماعت یا فرد کے گرد کبھی جمع نہیں ہوئے۔ اس باب میں منفرد ہیں۔ آپ نے لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر حکومت کی ہے لیکن کسی شخص سے کوئی غرض نہیں رکھی۔ ایک درویشانہ زندگی ہے۔ کوئی مرید چھپا کر کچھ نذر گزارنا چاہے تو فوراً مٹھی کھول دیتے ہیں جس جماعت میں گئے، اس سے کبھی ہوٹی

کوڑی تک نہیں لی۔ اُلٹا اسی کے لیے روپیہ فراہم کیا۔ زندگی بھر جو کمایا اس سے امرتسر میں دو مکان خرید کیے تھے۔ ایک میں خود رہتے، دوسرا کرایہ پر دے رکھا تھا۔ لیکن تقسیم کے وقت دونوں متروکہ ہو گئے۔ آج کل کرائے کے مکان میں ملتان رہ رہے ہیں۔ کسی سرکاری دفتر سے کوئی آرزو نہیں کی۔ حتیٰ کہ متروکہ جائیداد کے کلیم بھی داخل نہیں کیے ہیں۔

**عجیب و غریب**

آپ کے پاس ایک عجیب و غریب بٹوا ہے جس میں ایک مجذوب کی دی ہوئی پائیاں اور دھیلے پڑے ہیں۔ آپ کا خیال ہے، اس برکت سے اُن کا بٹوا کبھی خالی نہیں رہا ہے۔

**اولاد**

آپ کے چار لڑکے اور ایک لڑکی حیات ہیں۔ دو لڑکیاں انتقال کر چکی ہیں ایک کا انتقال بچپن میں ہوا، جب شاہ جی ڈم ڈم جیل میں قید تھے۔ دوسری نے قیامِ پاکستان کے بعد اڑھائی برس کی عمر میں زندگی ہار دی۔ بڑے صاحبزادے سید عطاء المنعم (ابوذر بخاری) عربی علم و ادب میں کمال دستگاہ رکھتے ہیں۔ باقی تین لڑکے بھی عربی مدرس میں پڑھتے ہیں کسی بچے کو بھی انگریزی کے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ آپ کے نیک نام داماد سید وکیل شاہ قانون کے طالب علم ہیں۔

**بڑھاپا**

عمر کے عہدِ آخر میں ہیں۔ بڑھاپا شروع ہو کر جوان ہو چکا ہے۔ بالوں میں سفیدی آ گئی ہے اصلی دانت جھڑ چکے ہیں، مصنوعی دانت لگوائے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> سفر ایک تھا ــــ منزلیں کئی ــــ بعض مقامات پر رُکنا پڑا، بعض جگہ ٹھہرنا پڑا، کچھ دیر سستائے، تلووں کو سہلایا۔ آبلوں اور کانٹوں میں معانقہ ہو چکا تو چلنے لگے، پھر چلتے ہی رہے، حتیٰ کہ ایک رات بیت گئی۔ دن چڑھا سورج نے شعاعوں کا چمن آراستہ کیا۔ غنچوں کا چہرا مسکرا اُٹھا۔ آنکھ اُٹھا کر

دیکھا تو گرد و پیش وہی رات کا سناٹا تھا۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

---

# قید و بند

"زندگی ہی کیا ہے؟ تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی، ایک چوتھائی جیل میں جتنے دنوں باہر رہا۔ لوگ گلے کا ہار بنتے گئے آج کلکتہ کل ڈھاکہ، ڈھاکہ سے لکھنؤ، لکھنؤ سے بمبئی، پھر آگرہ، آگرہ سے دہلی، دہلی سے لاہور، لاہور سے پشاور، پشاور سے کراچی۔ ذرا ہندوستان کے دیہات اور قصبات کا اندازہ کرلو، ہر کہیں گھوما پھرا ہوں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ تقریریں کی ہوں گی۔

دن کہیں، صبح کہیں، شام کہیں، رات کہیں

میں نے تقریر کی، لوگوں نے کہا "واہ شاہ جی واہ" میں قید ہو گیا، لوگوں نے کہا "آہ، شاہ جی آہ" ۔ اور واہ و آہ میں ہم ہو گئے تباہ.....!"

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

## اجتماعی قید

شاہ جی کی کل قید آٹھ اور نو سال کے لگ بھگ ہے۔ پہلی دفعہ آپ تحریکِ خلافت میں زیرِ دفعہ ۱۲۴ الف ۱۴ مارچ ۱۹۲۱ء کو بمقام امرتسر پکڑے گئے اور تین سال با مشقت قید کی سزا پائی جو تمام کی تمام بھگتی۔ دوسری دفعہ راج پال کے فتنہ کی سرکوبی میں ۶ جولائی ۱۹۲۷ء کو گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لیے قید کر دیے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے نمکین ستیہ گرہ کا آغاز کیا۔ تو آپ نے مولانا ابو الکلام آزاد اور پنڈت موتی لال نہرو کی خواہش پر تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ خیبر سے کلکتہ تک پولیس نے تعاقب کیا لیکن ہمیشہ جُل دے کر نکل جاتے رہے آخر ۲۰ اگست ۱۹۳۰ء کو دیناج پور میں پکڑے گئے اور ۲۰ اکتوبر کو چھ ماہ قید کا حکم سنایا گیا۔ یہ تمام عرصہ آپ نے علی پور اور ڈم ڈم جیل میں گزارا۔ ۱۹۳۲ء میں احرار نے تحریکِ کشمیر چلائی تو اس کی پاداش میں دھر لیے گئے اور دو سال جیل میں رہے۔

مرزائیت کا محاسبہ شروع کیا تو انگریزی عہد میں دو دفعہ پکڑے گئے۔ ایک دفعہ تو مسٹر جی ڈی کھوسلہ سشن جج گورداسپور نے تا بہ اجلاس عدالت کی سزا دے کر چھوڑ دیا اور مرزائیوں کے خلاف ایک تاریخی فیصلہ لکھا۔ دوسری دفعہ قادیان میں داخلہ کی پابندی توڑی اور تین ماہ کے لیے سزایاب ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے چند دن پیشتر سردار سکندر حیات کی وزارت نے $\frac{۳۰۲}{۱۱۷}$، ۱۲۱، ۱۲۴ اور ۱۵۳ الف ایسی سنگین دفعات کے تحت گرفتار کر لیا۔ ان دفعات کے تحت دو جگہ مقدمات دائر کیے گئے۔ راولپنڈی اور گجرات میں لیکن پولیس رپورٹر لالہ لدھا رام کے ایکا ایکی انکشاف نے وزارت کی "سازش" کو چوپٹ کر دیا۔ چھ ماہ جیل میں رہ کر بری ہو گئے۔

پاکستان میں تحریکِ ختمِ نبوت کی پاداش (۱۹۵۳ء) میں پکڑے گئے۔ ۲۷ فروری

۱۹۵۳ء کو کراچی میں راتوں رات پولیس نے گرفتار کیا اور سندھ کی مختلف جیلوں میں سیکورٹی ایکٹ کے تحت محبوس رکھا۔ کوئی ایک سال بعد مرافعہ دائر ہونے پہ لاہور ہائیکورٹ کے احکام سے چھوٹ گئے۔

مئی ۱۹۵۶ء میں آپ کو ملتان کے حدود میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ جولائی کے اواخر میں ڈاکٹر خان صاحب نے ان احکامات کو منسوخ کر دیا — خانیوال اور ملتان میں ۱۲ سیفٹی ایکٹ کے تحت دو مقدمے چلائے گئے مگر واپس لے لیے گئے۔

### تربیت گاہ

جیل خانے میں قیدی کی نفسیات عجیب و غریب ہوتی ہیں جہاں تک معنوی خصوصیت کا تعلق ہے وہ تو ہر قیدی کے باب میں یکساں ہے لیکن مختلف طبائع مختلف اثر فراہم کرتی ہیں۔

ہندوستان کی سیاسی تحریکوں میں اجتماعی قید و بند نے بہت سے لوگوں میں ادب و سیاست اور فکر و نظر کی وسعتیں پیدا کی ہیں ہر شخص بقدرِ استعداد ایک دوسرے سے مستفید ہوتا اور ذہناً پروان چڑھتا تھا۔ انھی صحبتوں سے سیاسی ذہنیت میں استقلال پیدا ہوتا اور مزاج میں پختگی آتی ہے۔ ہمارے کئی راہنماؤں اور بہت سے سیاسی کارکنوں کی معراج جیل خانے کی ان صحبتوں ہی کے فیضان کا نتیجہ ہے البتہ قیدِ تنہائی غور و فکر کی عادی طبیعتوں کے سوا عام حالات میں مہلک ثابت ہوئی ہے۔ جس سے مزاج میں تہور پیدا ہوتا ہے یا پھر غصہ جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاپن —— !

شاہ جی جب کبھی قید ہوئے عام جماعتی رفقا سے اُن کا ساتھ رہا۔ اگر کبھی علحدہ رہنا پڑا تو اپنی انجمن خود پیدا کر لی۔ جہاں گئے اپنی باغ و بہار طبیعت ساتھ لے گئے۔ اُن کی شخصیت کے گرد بڑائی کا ایک خاص ہالہ بنا ہوا ہے جس سے ہر کوئی اُن کے احترام پر

مجبور ہو جاتا ہے۔ قیدی سے لے کر افسر تک سب اُن کی طرف کھینچتے اور عزّت کرتے ہیں۔ چنانچہ "سکندر وزارت" کے عہد میں راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل کا انگریز سپرنٹنڈنٹ کرنل ہاڈر آپ کا گرویدہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ شاہ صاحب انگریزوں کے کٹر دشمن ہیں لیکن وُہ آپ کی شخصیت سے مُتاثر ہی نہیں مرعوب تھا۔ اس نے آپ کو بیڈمنٹن کھیلنے پر آمادہ کیا، شاہ جی جب تک راولپنڈی میں رہے۔ وُہ ہر شام آپ سے بیڈمنٹن کھیلا کرتا۔ ابھی حال ہی میں اُس نے "ہندوستان کی یادیں" ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں اپنے بعض مطالعات و تجربات کا ذکر کیا ہے۔ شاہ جی کے متعلق لکھا ہے:

"جن قیدیوں نے مجھے اثنائے ملازمت میں متاثر کیا، اُن میں عطاءُ اللہ شاہ بخاری نام کا ایک سیاسی قیدی بڑی ہی دل فریب شخصیت کا مالک تھا۔ اُس کا چہرہ مُہرہ چرچ کے اُن مقدّس راہبوں کی طرح تھا۔ جن کی تصویریں یسُوع مسیحؑ سے مشابہ ہوتی ہیں یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنھیں یورپ میں خاص عزّت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اُسے عرب کے بڑے بڑے قاموسیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن ان کے صحیح شناسا ہمارے ہاں کم ہیں؛ مَیں اُسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا۔ لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں مَیں تو اُس کی زبان کچھ نہ کچھ سمجھ ہی لیتا تھا لیکن وہ انگریزی سے قطعاً ناواقف تھا۔ اس کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ۱۸۵۷ء کے اُس "اینٹی برٹش" ذہن کی باقیات میں سے تھا جنھیں ہمارے پیشروؤں نے عُلما کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا۔"

**یادہائے رفتہ** شاہ جی تحریک خلافت کے ایّامِ اسیری کا ذکر بڑی حسرت سے

اور مسرت سے کرتے ہیں ان کی رائے میں وہ دن اُن کی زندگی کا حاصل تھے۔ تمام مُلک مولانا ابو الکلام آزاد کے الفاظ میں ایک بڑا جیل خانہ بن چکا تھا، بالخصوص پنجاب کے قید خانے اس وقت کے بڑے بڑے لوگوں کا دارُالعلوم تھے۔ شاہ جی سزا یابی کے فوراً بعد لاہور جیل میں رکھے گئے۔ جہاں ان کے ساتھ بابا گوردت سنگھ، لاجپت رائے، مولانا عبد المجید سالک، مولانا لقاء اللہ عثمانی، صوفی اقبال احمد پانی پتی، مولانا اختر علی خان، سردار سردول سنگھ کویشر، راجہ غلام قادر خان، سردار منگل سنگھ، پنڈت نیکی رام شرما اور بعض دُوسرے لوگ بھی محبوس تھے۔ کچھ دنوں بعد لالہ لاجپت رائے کے سوا گیارہ نفوس کا یہ قافلہ میانوالی جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں مولانا احمد سعید دہلوی اور ڈاکٹر ستیہ پال پہلے سے موجود تھے، ایک بزم آراستہ ہوگئی۔ اس قید و بند کے حالات مولانا عبد المجید سالک نے اپنی "سرگزشت" میں تفصیل سے لکھے ہیں، ملاحظہ ہو :

> جیل میں ایک احاطہ تھا جس کے دو حصّے تھے۔ ایک حصّے میں چار کوٹھڑیاں تھیں۔ اس کو "مُنڈے خانہ" (یعنی لڑکوں کا احاطہ) کہتے تھے اور ایک حصّے میں ایک بڑا اور کھلا کمرہ تھا جس میں سات آٹھ قیدیوں کے لیے گنجائش تھی چونکہ یہ کمرہ قیدِ محض (یعنی بے مشقت) والے قیدیوں کے لیے مخصُوص ہوتا تھا۔ اس لیے محض کمرہ کہلاتا تھا۔ یہ دونوں حصّے ایک درمیانی دروازے سے ملے ہوئے تھے۔ اختر علی خان، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا داؤد غزنوی، عبد العزیز انصاری، عطاءُ اللہ شاہ بخاری، مولوی لقاء اللہ، صوفی اقبال، راجہ غلام قادر خان، مولانا عبدُ اللہ چوڑی والے دہلوی، مَیں اور نذیر احمد سیماب "محض کمرے" اور مُنڈے خانے میں بھیج دیے گئے اور

وہیں ہمارے باورچی خانے کا انتظام کر دیا گیا۔ سردار سرد ول سنگھ کویشر سردار منگل سنگھ اور ان کے دو ہندو ساتھی، ہندو لیڈروں کے احاطے میں بھیج دیے گئے جس میں اب ڈاکٹر ستیہ پال، لالہ گردھاری لال امرتسری، لالہ ترلوک چند، دیش بندھو گپتا (تیج) اور متعدد مشہور کارکن آ گئے تھے ——

—— چند ہی ہفتوں میں میانوالی جیل سیاسی قیدیوں سے معمور ہو گیا اور رضا کاروں کے احاطوں سے قومی نعروں کی دلآویز صدائیں بلند ہونے لگیں۔ پڑھے لکھے قیدیوں نے مطالعہ وغیرہ کا مشغلہ اختیار کیا۔ چنانچہ ہم لوگوں کا پروگرام یہ ہوتا تھا صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوتے، نماز باجماعت ادا کی اور چائے پی۔ اس کے بعد میں اور عبدالعزیز انصاری مولانا احمد سعید سے ادب عربی صرف و نحو عربی اور منطق کا سبق لینے لگے۔ اختر علی خان اور راجہ غلام قادر خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے قرآن صحیح کرنے لگے۔ مولوی لقاء اللہ عثمانی اپنی سازشوں اور چوریوں میں مصروف ہو گئے یعنی فلاں فلاں مطلوبہ چیز کیونکر چوری چوری باہر سے منگوائی جائے اور فلاں پیغام فلاں شخص کو کس تدبیر سے پہنچایا جائے مولوی لقاء اللہ نماز میں ہم سب کے پیش امام بھی تھے اور یہ چوری چھپے کے کام بھی انھی کے سپرد تھے۔ چنانچہ میں نے ان کا لقب "امام السارقین" مقرر کیا تھا سید حبیب بعض وجوہ سے ہمارے ساتھ نہ ٹھہر سکے۔ اس لیے دوسرے احاطے میں چلے گئے تھے۔ ایک زمانہ میں وہ مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور مولانا داؤد سید حبیب کو عربی پڑھاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کو انگریزی آئی نہ ان کو عربی —— خیر میں دن بھر کا پروگرام عرض کر رہا

تھا۔ صبح ہم تھوڑی سی مشقت بھی کرتے تھے یعنی چرخے پر پانچ تار کا سوت، (صرف بقدر دو چھٹانک) دری بافی کے لیے بٹ دیا کرتے تھے۔ یہ کوئی بیس منٹ کا کام تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم کا سلسلہ ایک بجے تک جاری رہتا۔ اس وقت مولانا عبداللہ چوڑی والے للکار کے کہتے "ارے بھائی! کھانا تیار ہے"۔ اگرچہ ہمارا کھانا پکانے پر مشقتی قیدی مقرر تھے لیکن ہم نے باورچی خانے کا چارج مولانا عبداللہ کو دے رکھا تھا اور انھوں نے اپنے فرائض مفوضہ کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ انھی کا حصہ تھا۔ انھوں نے اپنی مہارت فن سے دہلی کے وہ وہ کھانے پکا کر ہمیں کھلائے ہیں کہ "جیل کو دیکھ کے گھر یاد آیا" سب اکٹھے بیٹھ کر لطف کے ساتھ کھانا کھاتے اور قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر اور عصر کے بعد چائے کا دوسرا دور جاری ہوتا۔ مغرب کے بعد کھانا کھایا جاتا اور عشا کے بعد بھی دیر تک مباحثے جاری رہتے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی۔ جس میں اختر علی خان گھڑا بجاتے۔ صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے۔ مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے۔ غرض ہم لوگوں کے مشاغل، صوم و صلوٰۃ، تلاوت قرآن، تعلیم و تعلّم اور تفریح و تفنّن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے لیکن بعض اوقات قوالی میں اتنا غلغلہ اور ولولہ ہوتا کہ دوسرے دن ہمارے ہمسائے یعنی پھانسی کی کوٹھڑیوں والے قیدی سپرنٹنڈنٹ جیل سے شکایت کرتے کہ حضور ہمیں یہاں سے کہیں اور بھیج دیجئے۔ یہ "مولبی" لوگ ہمیں ساری رات سونے نہیں دیتے ——— !

ب:— اب ہمارے کمرے میں ایک قابلِ قدر شخصیت کا اضافہ ہو چکا تھا۔ دہلی کے مولانا عبداللہ چوڑی والے آ چکے تھے اور اُن کی وجہ سے ایک خاص قسم کی شگفتگی دوستوں میں پیدا ہو چکی تھی۔ مولانا دہلی کے نہایت ممتاز قومی کارکن ہونے کے علاوہ مختلف قسم کے دہلوی کھانے پکانے میں بڑے ماہر تھے چنانچہ مولانا احمد سعید کی استدعا پر اُنھوں نے ہمارے باورچی خانے کا چارج لے لیا اور اسی دن سے ہمارے دسترخوان کی لذتوں میں اضافہ ہو گیا۔ کہیں کھڑے مسالے کا قورمہ پک رہا ہے، کبھی میٹھے ٹکڑے تیار ہو رہے ہیں، کبھی پُرتکلف قبولی کھچڑی تیار ہو رہی ہے کبھی ماش کی پھریری دال دسترخوان پر آ رہی ہے۔ چونکہ ہمیں دو چھٹانک فی کس کے حساب سے گھی ملتا تھا اور معمولی کھانوں میں استعمال ہونے کے بعد بچ رہتا تھا۔ اس لیے مولانا عبداللہ اس کا خشک حلوا تیار کر لیتے تھے اور اس کے قتلے کاٹ کاٹ کر سب دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ حلوا عام طور پر تیسرے پہر کی چائے کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ مولانا عبداللہ کی عمر تو اس وقت سینتیس اڑتیس سال سے زیادہ نہ تھی لیکن سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ داڑھی فرنچ کٹ تھی اور سُرخ و سفید رنگت پر بہار دیتی تھی۔ پرلے درجے کے ہنسوڑ اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے اور دلچسپ واقعات اور لطیفے سُنا کر ہم سب کا دل بہلاتے تھے (آج کل کراچی میں مقیم ہیں اور بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تندرستی کے ساتھ زندہ رکھے)۔

یوں تو بھی احباب شفیق اور محبت پرور تھے، مگر مولانا احمد سعید بے تکلف دوست ہونے کے علاوہ عربی میں میرے اُستاد بھی تھے۔ عبدالعزیز

انصاری بڑے قابل اور مخلص انسان اور تحصیل عربی میں میرے ہم سبق تھے ،
لقاء اللہ عثمانی ، صوفی اقبال احمد ، اختر علی خان سبھی سے برادرانہ تعلقات تھے
لیکن جو خصوصیت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے تھی وُہ اپنے رنگ میں مثال
نہ رکھتی تھی ۔ شاہ صاحب اُس زمانے میں شعر تو نہ کہتے تھے لیکن اُردو اور فارسی
میں شعر فہمی اور سخن سنجی کا ملکہ خصوصی رکھتے تھے ۔ اس کے علاوہ اُن کی شگفتگیٔ
طبع اُن کا خلوص ، اُن کی محبت پر وری بے مثال تھی ۔ بارہا ایسا ہُوا کہ رات کے
وقت دُوسرے احباب خوابِ غفلت میں پڑے خراٹے لے رہے ہیں اور میں
اور شاہ جی جو باتیں کرنے لگے تو رات کے تین بج گئے ۔ خدا جانے وُہ کون
سے موضوع تھے جس پر اس قدر طویل گفتگوئیں ہوتی تھیں لیکن دل چسپی کا یہ
عالم تھا کہ وقت گزرتا جاتا تھا اور ہمیں احساس تک نہ ہوتا تھا ۔

جیل کی زندگی میں لطیفوں کی کمی نہ تھی ۔ ایک دن شاہ صاحب نے
قصہ سُنایا کہ پٹنہ میں ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے جس میں " کا
تنابزوا بالالقاب " کی تفسیر کے سلسلے میں اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ کسی کی
چڑ مقرر نہ کرنی چاہیے جس سے دُوسرا شخص چڑ جائے ۔ مجلس وعظ میں ایک
مقامی تحصیل دار صاحب بیٹھے تھے ۔ اُنھوں نے پاس بیٹھے ہُوئے ایک صاحب
سے کہا ، لوگ یُونہی چڑ جاتے ہیں اگر کوئی شخص کسی کو چڑانے کی کوشش کرے
اور وُہ نہ چڑے تو کوئی بات ہی نہیں مخاطب نے جواب دیا ، نہیں حضرت
چڑ کی بات سے آدمی چڑ ہی جاتا ہے ۔ اس سے تغافل کرنا بڑا مشکل ہے تحصیلدار
صاحب قائل نہ ہُوئے تو دُوسرے شخص نے خاموشی اختیار کر لی ۔ دو چار منٹ

گزرے تھے کہ اس شخص نے تحصیل دار صاحب سے پوچھا، کیوں صاحب! آپکے ہاں شلجم کا اچار ہے۔ جواب ملا نہیں صاحب، میرے ہاں شلجم کا اچار نہیں ہے۔ کوئی دو منٹ کے بعد اس نے پھر سوال کیا، کیوں صاحب! آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے؟ تحصیلدار صاحب نے جواب دیا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ نہیں ہے۔ یہ بہت خوب کہہ کر پھر چُپ ہو گئے۔ لیکن ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پھر پُوچھا، تحصیل دار صاحب! آپ کے ہاں شلجم کا اچار تو ہوگا تحصیل دار صاحب برہم ہو گئے اور کہنے لگے، کیا آپ نے مجھے مسخرا مقرر کر رکھا ہے۔ تین دفعہ تو کہہ چکا ہوں کہ شلجم کا اچار نہیں ہے لیکن آپ برابر ہی پوچھتے جا رہے ہیں۔ اس شخص نے مُعافی مانگی اور خاموش ہو گیا لیکن ابھی دو ہی منٹ ہُوئے تھے کہ اس نے پھر وُہی سُوال دُہرایا، کیوں صاحب! آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے۔ اب تحصیلدار صاحب کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ کہنے لگے "عجیب بدتمیز ہو تم، یہ کیا بکواس ہے، شلجم کا اچار ہے، شلجم کا اچار ہے" ساری مجلس وعظ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مولوی صاحب نے وعظ روک دیا اور شخص نے فقط اتنا کہا کہ صاحب میں نے تو صرف یہ پُوچھا تھا کہ شلجم کا اچار تحصیلدار صاحب نے جُوتا پکڑ لیا۔ اب آگے آگے وُہ شخص اور پیچھے پیچھے تحصیلدار صاحب بھاگتے ہُوئے مجلس وعظ سے نکل کر بازار میں پہنچ گئے، وہ شخص بار بار پیچھے مُڑ کر پوچھتا، شلجم کا اچار ہے؟ تحصیلدار صاحب گالیاں دیتے ہُوئے اس کو مارنے دوڑتے۔ یہاں تک کہ شلجم کا اچار شہر بھر میں مشہور ہو گیا۔ تحصیلدار صاحب جدھر سے گزرتے لوگ بہانے بہانے شلجم کے اچار

کا ذکر چھیڑ کر اُن کو چڑاتے اور وُہ چڑ کر گالیاں بکتے۔ لطیفہ نہایت دل کش تھا۔ دن بھر یاروں میں اس کا چرچا رہا۔ تین چار دن کے بعد دوستوں نے سازش کی کہ سید عطاء اللہ شاہ کو چڑایا جائے، چنانچہ سب سے پہلے صوفی اقبال احمد، شاہ جی کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرکے پُوچھا، شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی۔ شاہ جی نے کہا، نہیں بھائی میرے پاس پن نہیں ہے۔ کوئی ایک منٹ بعد اختر علی خان پہنچے اور اسی طرح انگشتِ شہادت کے پورے سے اشارہ کرکے پُوچھا، کیوں شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی۔ شاہ جی نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ پن نہیں ہے۔ دو منٹ کے بعد ایک اور صاحب پہنچے، شاہ جی پن ہے؟ شاہ جی کے مزاج کا پارہ چڑھنے لگا۔ باہر نکل آئے اور کہنے لگے کیا تم سب کے ٹانکے اُدھڑ چکے ہیں کہ باری باری آکر مجھ سے پن مانگتے ہو۔ اتنے میں ایک اَور دوست پہنچ گئے اور نہایت متانت سے فرمانے لگے، شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی؟ شاہ جی نے اُنھیں بُری طرح ڈانٹا۔ اس کے بعد جو ہر طرف سے شاہ جی پن ہے، کے سوالات شروع ہوئے تو شاہ جی اتنے غصّے میں آئے کہ مادر و خواہر کی مغلظات تک سنا دیں۔ خیر ہم نے بڑی کوشش اور خوشامد درآمد سے اُن کے غُصّے کو ٹھنڈا کیا اور بتایا کہ ہم تو صرف شلجم کے اچار والے لطیفے کو دُہرا رہے تھے"

## جیل یا کھیل

جن لوگوں کو شاہ جی کے ساتھ جیل خانے میں رہنے کا اتفاق ہُوا ہے اُن کا بیان ہے کہ شاہ جی قید کو کبھی سیریس (Serious) نہیں لیتے بلکہ جیل خانے کی چار دیواری میں آپ کے قہقہے زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں۔ اکثر ہندو نوجوان جو جیل

میں ساتھ رہے تھے، آپ کی باغ و بہار طبیعت کے انتہائی گرویدہ تھے بالخصوص کمیونسٹ اور سوشلسٹ نوجوان جو آپ کی شخصیت سے پیار کرتے لیکن خطابت سے خوف کھاتے تھے مشہور ٹیررسٹ قیدی شیر جنگ نے آپ سے ملتان سنٹرل جیل میں ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھا تھا ایک دن اس نے سوال کیا :

"شاہ جی، قرآن میں یہ تو درج ہے کہ مسلمان آزاد رہ کر اس طرح زندگی بسر کریں لیکن یہ کہیں درج نہیں کہ غلام ہوں تو کیونکر زندگی گزاریں؟ سارے قرآن میں مسلمان اور غلامی کہیں بھی اکٹھے نہیں ہیں۔ آخر مسلمان جنگ آزادی میں حصّہ کیوں نہیں لیتے؟"

یہ بات شاہ جی کے دل میں اتر گئی۔ پھر کیا تھا مدت العمر مسلمانوں سے عام جلسوں میں اس کا جواب پوچھتے پھرے۔

ایک سوشلسٹ نوجوان نے جو آپ کے ساتھ قید میں تھا، سوال کیا : شاہ جی آپ نے کبھی نماز ترک کی ہے نہ روزہ ہی چھوڑا ہے، پھر آپ کا دل عام نمازیوں کی طرح سخت کیوں نہیں؟ شاہ جی مسکرائے، فرمایا، بھائی جو مذہب انسان کے دل کو گداز نہیں کرتا، وہ مذہب نہیں سیاست ہے اور مجھے ایسی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ جی نے جیل میں مونج کوٹی۔ بان بٹا اور گندم پیسی ہے لیکن عام طور پر مشقت سے بے نیاز ہی رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں آپ نے ٹوپی پہننا چھوڑ دی۔ کسی نے استفسار کیا تو فرمایا "پہلی دفعہ جیل گیا تو جیلر نے ہاتھ بڑھا کر ٹوپی اتارنا چاہی۔ میں نے ہاتھ روک لیا اور اتار کر خود پیش کر دی تب سے فیصلہ کر لیا ہے کہ ٹوپی نہیں پہنوں گا۔ بس یہ جو گوشہ رومال سر پر رکھتا ہوں"۔

اب تو جیل خانوں میں کافی اصلاح ہو چکی ہے۔ ایک زمانہ میں قیدی کو تین ماہ بعد ایک

خط لکھنے اور دو ماہ بعد ایک خط وصول لینے کا حق ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا جبر تھا نتیجۃً بہت سے قیدی بیرنگ خط لکھتے جو بیرونی سنسر شپ کی وجہ سے پکڑے جاتے اور ان کی سزا کا موجب ہوتے تھے۔ شاہ جی نے اس کا توڑ پیدا کیا پنڈت کرپا رام برھمچاری کے نام سے اپنے احباب کو دیناج پور جیل سے علی التواتر خط لکھتے رہے اور یہ نام سید عطا اللہ شاہ بخاری کا ترجمہ یا بدل تھا۔

آپ کی قید و بند کا یہ پہلو دلچسپ ہے کہ جب بھی آپ پر کوئی آفت ٹوٹی۔ بادل کے آوارہ ٹکڑے کی طرح نکل گئی مثلاً سکندر وزارت کے ساختہ مقدمات نہایت سنگین تھے۔ ان میں عمر قید یا سزائے موت کی سزائیں تھیں لیکن

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت۔

لاکھوں انسانوں کی دعائیں آپ کے شامل حال ہیں۔ ہزاروں افراد جن میں عابد شب زندہ دار سے لے کر زاہد مرتاض تک شریک ہیں آپ کے دعا گو ہیں چنانچہ بڑے سے بڑے معرکے یا مرحلے میں آپ کامیاب ہی نکلتے ہیں۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

بعض اہل اللہ نے آپ کو قرآنی وظائف بتا رکھے ہیں کوئی سی افتاد بھی پڑے۔ آپ ان کا ورد نہیں چھوڑتے۔ آپ کی کوئی سی قید بھی تحریکِ خلافت کے بعد طویل نہیں جس زمانہ میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلی۔ آپ اپنے واضح خیالات کے باوجود کھلے پھرتے رہے۔ اب کی ختم نبوت میں صورتِ حالات کا جو اندوہناک نقشہ جما، اس قید سے بھی ایک سال کے اندر اندر رہا ہو گئے۔ آپ کی تقریروں میں گرفت کا عنصر شاذ ہوتا ہے۔ تمام تقریریں مصرعۂ غزل

کی طرح اتنی رنگا رنگ ہوتی ہیں کہ انھیں اوّل تو قلمبند کرنا ہی دُشوار ہوتا ہے دوم اسالیب
مطالب کے جوڑ اس انداز پر منضبط ہوتے ہیں کہ سی آئی۔ ڈی کا محکمہ جن فضلائے عصر پر مشتمل ہے وہ لوگ
اُس کا فہم ہی نہیں رکھتے اور نہ اُن میں اس کی قدرت ہے۔

**سنگین مُقدمہ**

سکندر مرحوم کی وزارت نے آپ کو جس نازک موقع پر جن سنگین دفعات کے
تحت پکڑا تھا۔ اس کے پیشِ نظر ہر شخص کو اندیشہ تھا کہ عمر قید سے کیا کم سزا ہوگی؟
لیکن قُدرت نے دستگیری کی اور حالات نے معجزاتی طور پر پلٹا کھایا۔ جس رپورٹر (لدھارام) نے
تقریر کے نوٹس لیے تھے وہ ایکا ایکی فرنٹ ہوگیا۔ اُس نے لالہ لکھمی داس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ
گجرات کی عدالت میں ۱۸ دسمبر ۱۹۴۰ء کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ شاہ جی کے خلاف جو تقریر پیش
کی جارہی ہے وہ حکومت کے ایما پر فرضی تیار کی گئی ہے۔ چونکہ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے
کہ میں ایک بے گناہ شخص کو بلاوجہ مصیبت میں مبتلا نہ کروں۔ لہٰذا مجھے اصل حقیقت کے انکشاف
کی اجازت دی جائے۔

اس تاریخی بیان نے صُورتِ حالات ہی بدل دی۔ وزارت گھبرا اٹھی۔ ایڈووکیٹ جنرل
نے ۱۳ فروری ۱۹۴۰ء کو ہائی کورٹ میں درخواست گزرانی کہ چونکہ اس مُقدمہ میں استغاثہ کے گواہ
لدھارام نے صُوبہ کے وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے جس سے
مقدمہ کی نوعیت بدل گئی ہے لہٰذا مقدمہ کا فیصلہ عدالت عالیہ میں ہونا چاہیے۔ جسٹس سکیمپ نے
درخواست منظور کر لی۔ چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ اور جسٹس رام لال پر مشتمل ڈویژن بنچ نے گیارہ
مارچ کو سماعت شروع کی اور بارہ مارچ کو مقدمہ لدھارام کی شہادت کے لیے یکم اپریل پر
ملتوی ہوگیا۔ اس اثنا میں لدھارام زیرِ گردش رہا۔ یکم اپریل کو ڈرامائی انداز میں حاضرِ عدالت ہوگیا۔
اس کی شہادت تین دن جاری رہی جس میں اس نے عجیب غریب انکشاف کیے۔ عدالت العالیہ نے

اُسے جھوٹا قرار دے کر شاہ جی کو استغاثہ کی بے اعتبار شہادت کے پیش نظر رہا کر دیا۔ مسٹر ڈی فالشا سیشن جج لاہور نے، جون ۱۹۴۰ء کو دوسرے مقدمے میں بھی رہا کر دیا۔

لدھارام کے بیانات کا خلاصہ یہ تھا کہ جو تقریر اس عدالت میں پیش کی جا رہی ہے وہ بنائی گئی ہے کیونکہ جس شارٹ ہینڈ نوٹ بک پر اس نے تقریر کے حقیقی نوٹ لیے تھے اسے رپورٹنگ انسپکٹر کے مکان پر جلا دیا گیا تھا۔ اُسے یہ بتایا گیا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو وزیر اعظم پنجاب کی ایک خفیہ چٹھی ملی ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری گجرات کے ضلع میں یونینسٹ پارٹی کے خلاف منافرت پھیلانے آرہا ہے لہٰذا اس کی تقریر کے نوٹ اس طریق پر لیے جائیں کہ تقریر دفعات $\frac{۳۰۲}{۱۱۷}$ اور ۱۵۳ الف کی زد میں آجائے، اس کی تعمیل کی گئی پر اسی کیونٹنگ انسپکٹر نے ان مختصرات کی بنا پر نئے شارٹ ہینڈ نوٹ لکھ لئے اور ان سے لانگ ہینڈ نوٹ تیار کیے گئے جن کی بنا پر یہ مقدمہ قائم ہے۔

اس بیان نے سکندر وزارت کی اخلاقی ساکھ کو بے حد نقصان پہنچایا۔ جنگ کا زمانہ نہ ہوتا تو ممکن تھا اس کے نتائج سیاسی اعتبار سے کچھ اور ہوتے مگر جنگ کی وجہ سے بہت سی گرہیں کھلتے کھلتے رہ گئیں تاہم سکندر وزارت کو رسوائی کا داغ سہنا پڑا۔ سر ڈگلس ینگ نے آغاز مقدمہ سے کچھ دن پہلے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے اُن کی خواہش پر ملاقات کی۔ مولانا کو بتایا گیا تھا کہ سر ڈگلس اور سکندر حیات میں کسی بات پر شکر رنجی ہے۔ انھوں نے ساری رام کہانی سُنائی۔ سر ڈگلس نے بروایت وعدہ کیا کہ وہ سازش کا کھوج نکال کر دم لیں گے لیکن مولانا سے سوال کیا کہ احرار نے فوجی بھرتی کے خلاف جو ہنگامہ برپا کیا ہے۔ اس کا جواز کیا ہے؛ مولانا سوال کی گرفت سے چوکنے ہو گئے، کہنے لگے جب ہمارے خلاف اس قسم کے خطرناک مقدمات گھڑے جائیں تو اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہتا کہ فوجی بھرتی کی مخالفت کر کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ

میں قید ہو جائیں۔ اس طرح یونینسٹ وزارت کی منشا بھی پوری ہو جائے گی۔

اور احرار بھی مقابلۃً جھوٹے مقدمات کی طویل سزاؤں

سے محفوظ ہو جائیں گے۔ القصہ مقدمہ کی بہت سی راہیں سمٹ کر ایک خاص راہ پر آگئیں

نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ جی بری ہو گئے۔ سکندر حیات کے دامن پر چھینٹ تک نہ پڑی اور لدھا رام

انحراف شہادت میں تین سال کے لیے قید ہو گیا۔

بعض وزارتی راوی لدھا رام کی شہادت کا ایک دُوسرا رُخ پیش کرتے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ گجرات کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر برار کے خلاف رشوت ستانی کے بعض مقدمات زیرِ تفتیش تھے اور اُسے معطّل کیا جا چکا تھا اُس نے ان مقدمات کی واپسی کے لیے وزارت سے بلیک میل کیا یعنی لدھا رام کو جو اس کا مُرغ دست آموز تھا، اس طرح قربان کر کے اپنے آپ کو بچایا لدھا رام کی شہادت کے بعد وُہ بھی ایک گواہ ہو گیا، کیونکہ وزیر اعظم کی مبینہ چِٹھی پر صحیح روشنی ڈالنے کا مجاز وہی تھا۔ اس نے سودا کیا اور کامیاب رہا۔ اس برأت کے بعد شاہ جی پر قیام پاکستان تک کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ پاکستان بنا تو آپ سیاسیات سے ذہناً مستعفی ہو گئے لیکن قادیانیوں کا تعاقب جاری رکھا۔ آخر ۲۸ فروری ۱۹۵۲ء کو کراچی میں راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا، تو حکومت نے راتوں رات سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے سکھر جیل میں رکھا۔ ایک بڑے افسر نے آپ سے جیل میں ملاقات کی اور بزعم خویش نصیحت کرنے لگا:

"شاہ صاحب اسلامی حکومت قائم ہو چکی اور انگریز جا چکا ہے، مگر آپ ابھی تک پُرانے ڈگر پر قائم ہیں بھلا اپنی ہی حکومت کے خلاف ہنگامہ آرائی سے فائدہ؟ سوائے اس کے کہ اسلامی حکومت کمزور ہو گی؟"

شاہ جی ان بزرگوار کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے لہجے کی صناجی پر مُسکراتے ہوئے فرمایا

"جی ہاں میرے علم میں ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے لیکن

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

کچھ لوگ اسلامی حکومتوں میں برسرِ اقتدار ہوتے اور کچھ جیل خانے میں رہتے ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے، ہمیں ہمارا کام کرنے دیجیے تاریخ اپنے آپ کو اسی طرح دُہراتی ہے۔"

**تجربہ گاہ**

شاہ جی نے جیل خانے میں بڑے بڑے تجربے حاصل کیے ہیں اُن کا عقیدہ ہے کہ جیل خانہ ترازو ہے اور کسوٹی بھی جس سے ہر انسان کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے کسی انسان کا ظرف پرکھنا ہو یا یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ کیا ہے؟ تو اُسے دسترخوان یا جیل خانے میں پہچاننے کی کوشش کرو۔ دونوں جگہیں ایسی ہیں جہاں انسان بولتا ہے اس معیار پر انھوں نے بے شمار لوگوں کو پرکھا اور تولا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر افراد کے معاملہ میں اُن کی رائے بڑی صاف اور ستھری ہے جہاں تک سیاسی تحریکوں میں قید ہونے والے افراد کا تعلق ہے وہ جیل خانے کو تربیت گاہ سمجھتے ہیں لیکن اخلاقی مجرموں کے بارے میں اُن کا نقطۂ نگاہ ہی دوسرا ہے اُن کا خیال ہے کہ جیل خانے مجرموں کو مزید مجرم بناتے ہیں یہاں اصلاحِ احوال کی توقع ہی عبث ہے جو خرابیاں ایک اخلاقی قیدی کو جیل خانے میں سوجھتی اور سُجھائی جاتی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ ایک طرف خطرناک جُرم پرورش پاتے ہیں، دوسری طرف سزا کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

قانون و سزا کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر حکیمانہ ہے وہ قانون کو حکیم سولن کے الفاظ میں مکڑی کا جالا سمجھتے ہیں جو طاقتور سے ٹوٹ جاتا اور کمزور کو پھانس لیتا ہے اُن کی نظر میں قانون جُرم سے زیادہ سخت ہے اور سزا کے بارے میں اُن کی رائے یہ ہے کہ

محض انتقام ہے۔ اپنی قید و بند کے خلاف انھیں کوئی شکایت نہیں کسی افسر مجاز سے گلہ نہیں جو صعوبتیں پیش آئیں، انھیں بچشم قبول کیا۔ البتہ کبھی کبھار تقریر کا رنگ باندھنے کے لیے کہا کرتے ہیں:-

"جیل خانہ میری بیوی کے نکاح نامہ میں تو نہیں لکھا تھا اور نہ وہ عفیفہ خاتون اپنے جہیز ہی میں ساتھ لائی تھیں۔"

لیکن جب ایک حساس انسان اُن کے گنجلک بالوں کی سپیدی، کُھلے ماتھے کی سلوٹیں اور متحرک آنکھوں کی عقبی لہروں پر اچٹتی ہوئی نظریں اُٹھاتا ہے تو معاً مصائب کی ایک ایسی تاریخ سامنے آجاتی ہے جس کا سرنوشت ہے۔

نالہ از بہرِ رہائی نہ کُند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

# جماعتِ احرار

شاہ جی اور احرار میں گل و بلبل کا رشتہ ہے جس طرح خطابت کے بغیر شاہ جی کا تصور نہیں بندھتا اُسی طرح شاہ جی کی نفی سے احرار اضافی ہو جاتے ہیں دونوں میں جسم و جان کا تعلق ہے۔

تحریکِ احرار بڑے ہی گہرے تجزیہ کی مستحق ہے جتنا گرد و غبار تاریخِ احرار پر ڈالا گیا، غالباً اُس دَور کی کوئی اور تحریک اتنی خاک بسر نظر نہیں آتی اس کے خارجی وجوہ بہت سے ہیں، لیکن داخلی وجہ خود احرار ہیں جتنی بڑی بڑی نا انصافیاں ان لوگوں نے خود اپنے ساتھ کی ہیں اُن کا عشرِ عشیر بھی دُوسروں نے ان کے ساتھ روا نہیں رکھا۔ اُن پر رسوائی کی منوں مٹی ڈالی گئی لیکن وہ ویسے ضرور مٹے نہیں۔ انھوں نے "قلم" کے اس دَور کو بھی "زبان" کا دَور سمجھا اور کوشش کی کہ حال پر جھنجلائیں مستقبل کے خواب دیکھیں اور ماضی کے گیت گائیں نتیجۃً اُن کی سیاسی حیثیت اُن مزارعین کی سی ہو گئی جو بنجر زمینوں میں ہل جوتتے، اُن کو پانی دیتے

فصل پکاتے لیکن کٹائی کے وقت بیدخل ہو جاتے ہیں یا ان معماروں کی طرح ہیں جو عمارت تو کھڑی کرتے ہیں لیکن اس میں رہ نہیں سکتے۔

جماعتِ احرار کو پرکھنے کے لیے کئی ترازوؤں کی ضرورت ہے احرار کون ہیں؟ انھوں نے کیا کیا؟ اُن کے مثبت و منفی کارنامے کیا ہیں؟ جب تک ہم سارے گرد و پیش کو معلوم نہ کرلیں اور اُن حالات و واقعات پر نظر نہ رکھیں جن کا ردِ عمل احرار تھے اور جو احرار کے ردِ عمل کا نتیجہ ہیں، اس وقت تک ہم احرار پر صحیح تنقید نہیں کر سکتے اور نہ اس انصاف کو قریب لاسکتے ہیں جس کی مؤرخانہ حیثیت سے ہر لحظہ ضرورت ہے۔

احرار کے ایک دو بڑے رہنماؤں کا نام ہندوستان کے ہر گوشہ تک پہنچا اور انھیں ایک گونہ شہرت بھی حاصل ہوئی لیکن وہ کُل ہند رہنما کبھی نہ بن سکے ان کا نام تو نمایاں ہی رہا مگر وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جہاں مہاتما گاندھی، قائدِ اعظم، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہر اور سبھاش چندر بوس نظر آتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنے تمام کمالات کے باوجود ہندوستان کے سیاسی راہنماؤں کی صفِ اول میں نہ تھے۔ اُن کا اثر مرحوم پنجاب تک محدود رہا اس کے علاوہ وہ سرحد کے دو تین ضلعوں ریاست بہاول پور۔ دہلی کے قرب و جوار اور یوپی کے بعض بڑے شہروں میں بھی مقبول تھے، لیکن ان کی تحریک یا تنظیم کے ثمرات پنجاب ہی میں تھے گویا اُن کے نام اور کام کا تذکرہ کیے بغیر پنجاب کی سیاسی تاریخ مکمل نہیں ہوتی لیکن اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ شہروں اور قصبوں میں وہ ایک سیاسی تحریک کی حیثیت رکھتے تھے۔

۲۔ دیہات میں انھیں ایک تبلیغی جماعت کے طور پر رسوخ حاصل تھا۔

سارا پنجاب اُن سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ شمال مغربی ضلعوں کے لیے وہ اجنبی ہی رہے ہیں۔

پنجاب کو برطانوی سلطنت میں جو مقام حاصل رہا وہ ظاہر و باہر ہے۔ چودھری افضل حق کے الفاظ میں پنجاب برطانوی مقبوضات کی شہ رگ تھا انگریزوں نے یہاں کے لوگوں سے بڑے بڑے فوائد حاصل کیے۔ برطانوی سلطنت کو وسیع اور مضبوط بنانے میں پنجابی سپاہیوں نے غیر المعقول کارنامے سرانجام دیے، جتنا بہادر اور سستا سپاہی پنجاب سے ملتا رہا اُس کی مثال نہیں شاہ جی پنجاب کی اس "وفاداری بہ شرطِ استواری" پر ازراہِ تعریض کہا کرتے تھے کہ فلاں فلاں ضلع کی مائیں تو بچے ہی بابا فرنگی کے لیے پیدا کرتی ہیں اور جو کارنامے برطانوی ہندوستان کی غلامی کو برقرار رکھنے کے لیے اس صوبہ کے بڑے بڑے خاندانوں نے سرانجام دیے اس سے انگریزی مفاد کو بڑی تقویت پہنچی۔

## انوکھی خصوصیت

انگریز ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ حریت میں جان چکے تھے کہ پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ ہے جو ہر کڑے وقت میں اُن کے استعماری مقاصد کا پشتیبان ہو سکتا ہے۔ لیکن تریسٹھ برس بعد تحریکِ خلافت نے ہندو مسلم اتحاد کا جو منظر پیش کیا اس سے انگریز خوف زدہ ہو گئے انھوں نے تحریک کے فوراً بعد اس اتحاد کو ہمیشہ کے لیے پارہ پارہ کر ڈالا اور پنجاب میں تو وہ اس اتحاد کو مطلقاً نہ چاہتے تھے یہاں ہندو مسلم اتحاد تو ایک طرف رہا انھیں مسلمانوں میں کسی ایسی سیاسی تنظیم یا سیاسی تحریک کا وجود بھی گوارا نہ تھا وہ سیاستہً پنجاب کو برطانوی ہندوستان کی سرحد سمجھتے تھے۔ انھوں نے پنجاب کو فوجی صوبہ بنا ڈالا اور اس کے مختلف عوامل و عناصر کو اس طرح قابو میں رکھا کہ برطانوی مقاصد کے لیے تو وہ مختلف المذاہب ہونے کے باوصف ایک تھے لیکن ملکی مقاصد میں ایک دوسرے کے خلاف تھے چنانچہ اس ضمن میں چند باتیں خصوصیت سے قابلِ غور ہیں۔

(۱) ہندوستان کے سیاسی رجحانات سے پنجاب کو الگ تھلگ رکھنے کی انتہائی کوشش

کی گئی بالخصوص مسلمانوں میں نہ تو کسی مرکزی مسلمان لیڈرشپ کا اثر بڑھنے دیا گیا اور نہ کسی صوبائی انقلابی قیادت کے لیے کام کا راستہ ہموار ہونے دیا۔

(ب) پنجاب میں دوسرے صوبوں کی طرح صرف ہندو مسلم مسئلہ ہی پیدا نہیں کیا گیا بلکہ ایک تیسرا مسئلہ سکھوں کا اٹھایا گیا جس سے فرقہ واریت کا عقدہ "لاینحل" ہو گیا۔

(ج) ملک کے فرقہ وارانہ مسئلہ میں انگریزی اغراض کے ایما پر جو شدت پیدا ہوتی گئی، اُس کا سرچشمہ پنجاب تھا۔

(د) تحریکِ خلافت کے بعد فرقہ وارانہ مناقشات کی جو رَو چلی اُس کا سرآغاز کوہاٹ اور سرچشمہ دہلی تھے لیکن اس کی اصل طاقت پنجاب تھا۔

**حقیقی مُہرے**

اِن اغراض کی تکمیل کے لیے جو مہرے کام کر رہے تھے وُہ راون کے بارہ سروں کی طرح تھے مثلاً:

۱۔ پنجاب کی ہر قوم میں بڑے بڑے زمیندار التزاماً پیدا کیے گئے اُن کا اپنے دوائر میں استبدادی اثر تھا۔

۲۔ مسلمانوں پر قابو پانے کے لیے پیروں کی روایتی گدیاں نہ صرف بحال رکھی گئیں بلکہ مزید گدیاں پیدا کی گئیں۔

۳۔ بعض سرحدی اضلاع میں کئی لاکھ اور کئی کئی ہزار ایکڑ زمین کا مالک ایک سردار ایک مہاراجہ، ایک خان یا ایک نواب کو بنا دیا گیا۔

۴۔ عام لوگوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کیلئے بہ لطائف الحیل اکثر دروازے بند رکھے گئے۔

۵۔ مسلمانوں میں ان لوگوں کا اثر و رسوخ بطورِ خاص پیدا کیا گیا جو برطانوی بساط کے دلپسند مُہرے تھے۔

۶۔ عام مذہبی پیشواؤں کو مطیع و منقاد رکھا ان کی معرفت اصل اسلام کو مجروح کیا اور چند خاص قسم کی عصبیتوں کو رواج دیا۔

۷۔ ملّا کا دین "فی سبیل اللہ" فساد بنا دیا جس سے عام مسلمانوں میں اُن کی توقیر ختم ہو گئی، اور دیہات میں تو انھیں زمینداروں کا کمین سمجھا جانے لگا۔

۸۔ مسلمانوں میں اسلام کی بنیادی رُوح ختم کرنے کے لیے خانہ ساز نبوّت پیدا کی گئی۔ اہلِ طریقت کو بہ لطائف الحیل اس راہ پر لا ڈالا کہ ان کی گدیاں مسلمانوں کے اندرونی خلفشار اور باہمی تو تکار کا مرکز بن گئیں۔

۹۔ مسلمانوں کی معیشی زندگی کو نامسلمانوں کے تابع کر دیا گیا عام مسلمانوں میں سے صرف سپاہی لیے گئے یا کلرک جن چند خاندانوں کے افراد کو آگے لایا گیا وہ پشتینی وفادار تھے یا وہ لوگ جن کا وجود قومی عزّت کے منافی تھا ان لوگوں نے انگریزوں سے بڑھ کر برطانوی سلطنت کی بقا کے لیے جاں نثاری کا ثبوت مہیا کیا۔

۱۰۔ پنجابی مسلمانوں کی بیشتر آبادیاں آبائی رسوم کا شکار تھیں ان کے نام تک مسلمان نہ تھے انھیں کلمہ طیبہ تو ایک طرف السلام علیکم کہنا بھی نہ آتا تھا۔

۱۱۔ ہندوؤں نے ان کا معاشی اور مجلسی مقاطعہ کر رکھا تھا اور وہ عملاً انھیں غیر ہندوستانی ہی سمجھتے تھے۔

۱۲۔ نیشنل کانگرس کے عام راہنما (مسلم لیگ کے عوامی تحریک بننے سے پہلے) مسلمانوں کو کانگرس میں شمول کی دعوت تو دیتے تھے لیکن عملاً ان پر کانگرس کے دروازے بند رکھتے تھے۔

۱۳۔ صوبہ کے عام باشندے بالخصوص مسلمان حکومت سے اتنے خوف زدہ تھے کہ ایک کنسٹیبل کو

بھی حاکم مطلق سمجھتے تھے۔

۱۴۔ جن خاندانوں کو مسلمانوں کی تقدیر کا مالک بنا دیا گیا اُن کی تاریخ اتنی شرمناک اور ہولناک ہے کہ اس تاریخ میں مُلکی مفاد سے غدّاری اور عوام پر جور و ستم کے سوا ایک صفحہ بھی قومی ہمدردی کا نہیں ہے۔

۱۵۔ مسلمانوں کے اس گروہ کا یہ شعار ہو چکا تھا کہ وہ اسلامی مُلکوں اور قومی تحریکوں کے خلاف جاسوسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

۱۶۔ مثلاً۔ تحریکِ لاتعاون میں جب خلافتی رضا کار علماء کے فتویٰ کی کاپیاں تقسیم کرنے کے لیے سر عمر حیات خاں ٹوانہ کے علاقے میں گئے تو ان کے ساتھ بیمارز سلوک کیا گیا۔ رضا کاروں کو اغوا کر کے حاشیہ برداروں میں بانٹ دیا گیا جنھوں نے اُن کے ساتھ مُنہ کالا کیا۔ اس صدمہ کی تاب نہ لا کر ایک نوجوان نے خودکشی کر لی۔

ضلع میانوالی کی ایک تحصیل میں شاہ جی پہلی دفعہ تقریر کے لیے گئے تو کسی مسلمان نے نے انھیں ٹھہرایا تک نہیں ایک ہندو نے شب بسری کی جگہ دی تو اسے گاؤں چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ تنگ آ کر بھاگ نکلا ازاں بعد اُس کے مکان کو آگ لگا دی گئی۔

جس صوبہ کا ناک نقشہ یہ ہو اس میں کسی ایسی تحریک کی بنیاد رکھنا جس کی عنان شہر کے ادنیٰ متوسط طبقے کے ہاتھ میں ہو اور جو "اینٹی برٹش" ذہن رکھتا ہو ایک دلیرانہ فیصلہ تھا جس کے عواقب و نتائج کا غالباً خود اسے بھی صحیح اندازہ نہ تھا۔

### جماعتِ احرار کی بُنیاد

جن لوگوں نے احرار کی بُنیاد رکھی اُن میں مولانا ظفر علی خاں مولانا داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق مولانا مظہر علی اظہر خواجہ عبدالرحمٰن غازی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پیش پیش تھے۔[1]

---

[1] احرار اسلام کے خطبات و قرار دادیں صـ ۱۲ ماخوذ: "مسلمانوں کا روشن مستقبل صـ ۴۲۶"

مولانا شوکت علی مرحوم نے ذاتی ناراضی کی بنا پر پنجاب خلافت کمیٹی کو غیر آئینی قرار دیا تو ان پنجابی راہنماؤں نے ۱۹۲۸ء کے اواخر میں علیحدہ تنظیم کے امکانات پر سوچ بچار کیا اور ۲۹ ردسمبر ۱۹۲۹ء کو چودھری افضل حق مرحوم کی صدارت میں جماعتِ احرار کی بنیاد ڈالی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری پہلے صدر منتخب کیے گئے۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگرس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا اور اپریل ۱۹۳۰ء میں نمکین ستیہ گرہ کا آغاز کر دیا۔ احرار ذہناً کانگرس کے ساتھ تھے انھوں نے اپنی تنظیم کو ادھورا چھوڑا اور کانگرس میں شریک ہو کر سول نافرمانی میں حصّہ لینے لگے۔ گاندھی اِروِن میثاق کے تحت جب عفوِ عام کا اعلان ہو گیا تو پنجاب میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے سوا سب رہا کر دیے گئے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی صدارت میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں احرار راہنما، مندوبین کے ضلعی انتخابات کا حشر دیکھ کر شریک ہوئے تھے۔ انھیں ہندو سرمایہ کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا جب کراچی میں بھی صُورتِ حالات موافق نظر نہ آئی تو علیحدگی کا ذہن اور پختہ ہو گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں احرار کی کانگرس سے علیحدگی کا سبب ورکنگ کمیٹی میں اُن کے نمائندے کی عدم شرکت بیان کیا ہے لیکن چودھری افضل حق مرحوم و مغفور نے تاریخ احرار میں اسے پنڈت جی کی "کج نگہی" کہا ہے۔

بہر حال جماعتِ احرار نے (جولائی ۱۹۳۱ء) اپنی پہلی کانفرنس حبیبیہ ہال لاہور میں منعقد کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن لُدھیانوی کانفرنس کے صدر تھے۔ اِس کانفرنس میں کانگرس کی مسلّمہ روایت کے خلاف جُداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا گیا بس اس پر ہندو پریس نے آسمان سر پہ اُٹھا لیا اور احرار کو کانگرس کا باغی قرار دے کر متہم کرنا شروع کیا۔

احرار کا ذہن آزادیٔ ہندوستان کے سوال پر تو کانگریس سے اسی طرح قریب تھا۔

لیکن ہندو رہنماؤں اور ہندو اخباروں نے احرار کے خلاف اس شدّومد سے پراپگنڈہ کیا کہ پنجابی مسلمانوں میں اُن کا وجود ایک فعال عوامی تنظیم کی صورت اختیار کر گیا اور یہ پہلا مرحلہ تھا، جب مسلمانوں میں ہندوؤں سے علیحدگی کا ہمہ گیر ذہن ایک ایسی اجتماعی تحریک سے وابستہ ہو گیا جس نے جان گنتھر کے الفاظ میں مذہب کے راستہ عوام میں سیاسی رسوخ حاصل کیا۔ ——جس کا بدیہی نتیجہ مسلمانوں کا وہ جذبہ تھا جس نے ہندوؤں کی کوتاہ نظریوں سے مشتعل اور منضبط ہو کر پاکستان کی بنیاد رکھی۔ احرار جو کچھ کہتے رہے، وہ تحریکِ پاکستان کے خلاف تھا جو کچھ کیا وہ پاکستان کے حق میں تھا۔

**تحریکِ کشمیر** احرار کی سیاسی زور آزمائیوں میں تحریکِ کشمیر کو اولیت حاصل ہے اس تحریک کے بہت سے برگ و بار تھے مثلاً تحریک کا ایک رُخ یہ تھا کہ:

۱۔ تحریکِ خلافت کے بعد مسلمانوں نے پہلی دفعہ کسی تحریک میں اس جرأت سے حصہ لیا کہ چالیس یا پینتالیس ہزار کے قریب لوگ رضا کارانہ طور پر قید ہو گئے جن میں سے کئی نوجوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

۲۔ تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے اور اس تحریک کو تحریکِ لاتعاون کا اجتماعی ذہن حاصل تھا لیکن تحریکِ کشمیر محض مسلمانوں کے بل پر اٹھی اس میں حصہ لینے والے ننانوے فی صد ایک ہی صوبہ کے مسلمان تھے جنھیں ابتداءً حکّامِ ریاست کے علاوہ عام ہندوؤں اور نیشنلسٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر میں برطانوی حکومت اور اس کے خود کاشتہ مسلمان اُمرا کے عناد کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

۳۔ ریاست کے اندرونی راہنماؤں بالخصوص شیخ عبداللہ نے کئی اسباب کی بنا پر احرار سے گریز کیا لیکن بالآخر ذمہ دار حکومت کے اسی مطالبہ پر پہنچے جس سے بارہ برس پہلے

انھیں اس لیے بھی اختلاف تھا کہ اس کے مجوز احرار تھے۔

۴۔ اس تحریک نے ملک کی تمام ریاستوں کے استبدادی نظام کو ذہنی طور پر ہلا ڈالا۔ جس سے زمانہ شناس حکمرانوں نے مستقبل کے رجحانات کا واضح طور پر اندازہ کر لیا ریاستی باشندوں میں سیاسی شعور نے راہ پائی مزید براں اُن میں غیرتِ نفس کا احساس پیدا ہو گیا۔

۵۔ قادیانی جماعت کے سیاسی خدوخال کی صحیح وضاحت کا پہلی دفعہ سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

۶۔ عام مسلمانوں میں اس ذہن کو نشوونما حاصل ہونے لگا کہ طبقاتی شعور ہی معاشرے کے روگوں کا صحیح علاج ہے۔

دوسرا رُخ یہ تھا کہ :

۱۔ حکام ریاست نے پہلے تو احرار کو نظر انداز کیا پھر ترغیب وتحریص کا دام بچھایا جب یہ دونوں داؤں ناکام ہو گئے تو اندرونِ ریاست کے راہنماؤں سے سمجھوتہ کر کے سہ طرفہ حملہ شروع کر دیا۔

د۔ ریاستی راہنماؤں کو نہ صرف احرار کی ہمنوائی سے روک دیا گیا بلکہ اُن سے کنارہ کشی کا اعلان کرا ڈالا۔

ب۔ ریاست سے باہر پوری ہندو قوم کو بلاتفریقِ عقیدہ وخیال مخالف بنا دیا گیا۔ حتیٰ کہ مہاتما گاندھی کو بھی گول میز کانفرنس (لندن) میں اعلان کرنا پڑا، کہ تحریکِ کشمیر سے انگریزوں کو تقویت پہنچنے کا امکان ہے۔

ج۔ مسلمانوں کے ان عناصر سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی گئی، جو احرار کی سیاسی ساکھ سے خار کھاتے تھے اور جنھیں احرار کا یہ عروج گوارا نہ تھا۔

۲۔ انگریزوں کا منشا شروع میں کچھ اور تھا جس طرح تحریکِ خلافت کے فوراً بعد ہندو مسلم اتحاد کو غتر بود کرنے کے لیے ہندو مسلم فسادات کا تخم بو دیا گیا تھا اسی طرح وہ اب ۱۹۳۱ء کی سول نافرمانی کے یشاقی خاتمہ پر چاہتے تھے کہ:

۱۔ جن چند ہزار (کانگریس کی رپورٹ کے مطابق چودہ ہزار) مسلمانوں نے تحریکِ سول نافرمانی میں حصہ لیا ہے، وہ بھی اپنے آپ کو آئندہ کے لیے منقطع کر لیں۔ یا اُن کا رسوخ ضائع ہو جائے۔

۲۔ سرحد میں سُرخ پوشوں کی نئی طاقت کا فروغ انگریزوں کے لیے سوہانِ رُوح تھا وہ قصہ خوانی بازار کے واقعہ ہائلہ سے نہ صرف مرعوب تھے بلکہ ایک سرحدی صوبہ میں اس صُورتِ حالات سے خائف بھی تھے اُن کے نزدیک اس کا تدارک دو قومی نظریہ کے تصادم و تکرار ہی سے ہو سکتا تھا۔

۳۔ انہی دنوں لندن میں تیسری گول میز کانفرنس ہو رہی تھی، گاندھی جی کو اصرار تھا کہ وہ تمام ہندوستان کے نمائندے ہیں۔ اِدھر مسلمان نمائندے ان کے اس دعویٰ کی تغلیط کے لیے مُوجود تھے چنانچہ کشمیر کے قضیہ نے ہندو مسلم مغائرت کا واضح ثبوت مُہیا کر دیا تھا۔

۴۔ ان اغراض کو ملحوظ رکھتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے کوشش کی کہ وہ اپنے فرستادہ لوگوں کی معرفت کام لے چنانچہ ان عناصر نے علامہ اقبال کو لیپا پوتی کر کے اپنے ساتھ ملا لیا آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی برطانوی سیاست کا سب سے کامیاب مُہرہ مرزا بشیر الدین محمود احمد اس کا صدر بن بیٹھا لیکن احرار نے راستہ روک لیا۔ احرار کو اپنی علیحدہ جماعتی زندگی کی نیو اُٹھانے کے لیے سیاسی میدان چاہیے تھا جو قدرت نے

مُہیا کر دیا علامہ اقبال نے ان کی استدعا پر کشمیر کمیٹی سے استعفادے دیا۔ احرار اُٹھے اور چھا گئے۔ انگریزوں نے بوجوہ چُپ سادھ لی اُمرا اشارہ پلتے ہی معاون بن بیٹھے احرار نے غنیمت سمجھا اور رائی سے دامے سخنے فائدہ اٹھایا لیکن رکھا ٹھکانے پر آخر ریاست نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے۔ وائسرائے نے آرڈی نینس نافذ کر دیا جس سے تحریک کا رُخ بدل گیا۔ امرا واپس ہو گئے صُورتِ حالات کا نقشہ اس طرح ہو گیا۔:

۱۔ انگریز چالیس پینتالیس ہزار افراد کی رضا کارانہ اسیری کو مسلمانوں میں ایک ایسے ذہن کا نشو سمجھنے لگا جس کا اس سے پہلے اُسے اندازہ نہ تھا۔ اور پنجاب میں تو وہ اُسے مطلق ہی گوارا نہ کرتا تھا۔

۲۔ مسلمان امرا کو یہ طبعاً ناپسند تھا کہ اپنی گدّیاں اُن لوگوں کے لیے خالی کر دیں۔ جنھیں وہ ازراہِ تعریض کنگلے کہتے آئے تھے۔

۳۔ خود مُسلمان امرا نے آج تک یہ گوارا نہ کیا تھا کہ مسلمانوں میں کسی ایسی عوامی تحریک کو اُبھرنے دیں جس کی باگ ڈور غربا کے ہاتھ میں ہو یا اُن کا رسوخ بڑھے۔

۴۔ نواب اسمٰعیل میرٹھی کی معرفت وائسرائے نے چودھری افضل حق سے ملنا چاہا تو اُن اُمرا نے احتجاج کیا کہ آپ فروتر لوگوں سے مِل کر اپنے مرتبہ کو گھٹانے کی غلطی نہ کیجیے

۵۔ قادیانی جماعت کے لیے بدلہ چکانے کا یہ بہترین موقع تھا نتیجہ یہ نکلا کہ احرار کو اس سارے قضیہ میں اتنی بڑی قربانی کے باوجود شکستِ فاش ہوئی ریاست نے ہتھیار ڈال کر ہتھیار اٹھا لیے انگریزوں نے مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا مسلمان اُمرا نہ صرف اُلٹے پاؤں بھاگ گئے بلکہ اس سوچ میں لگ گئے کہ احرار نے پنجاب میں جو اثر پیدا کیا ہے اُس کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے ہندو شروع سے بیزار تھے ملک کی سب سے

بڑی سیاسی تنظیم کانگریس نے احرار کو نافرمان سمجھ کر سیاسی اچھوت بنا دیا۔ وہ مسلمان راہنما جو
احرار کے ہم خیال یا ہم سفر رہے تھے احرار کی اس مقبولیت کو اپنی سرمایہ وارانہ شخصیتوں کے
لیے مضر سمجھتے اور چاہتے تھے کہ احرار بہرصورت ختم ہو جائیں۔

**تحریک کپورتھلہ**

احرار کا دوسرا عوامی محاذ ریاست کپورتھلہ کی کسان تحریک (۱۹۳۳ء)
تھا ریاست نے خود مسلمان اُمرا کی معرفت اس تحریک کا گلا گھونٹ دیا
وہاں وزیر اعظم مسلمان تھا اس نے ایک ہوشیار شاطر کی طرح صف آرا قوتوں کو چاروں شانے
چت کیا مگر احرار ہر حال میں ایک سیاسی طاقت بن چکے تھے ایکا ایکی شہید گنج کے انہدام نے اس
طاقت کو اس بُری طرح برباد کیا کہ پھر وہ سنبھالے تو لیتے رہے لیکن سنبھل نہ سکے جس تیزی سے
وہ ابھرے تھے اُسی سُرعت سے انھیں پسپا ہونا پڑا۔

**کمیونل ایوارڈ**

اواخر ۱۹۳۲ء میں کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تو گاندھی جی جیل میں تھے
اس ایوارڈ میں اچھوتوں کو ہندوؤں سے علحدہ رکھا گیا تھا گاندھی جی نے
اس علحدگی کے خلاف مرن برت رکھا گورنمنٹ نے گھبرا کر انھیں چھوڑ دیا۔ اس پر اچھوت راہنماؤں
اور اُن کے مابین پونا پیکٹ ہو گیا جو ریمزے مکڈانلڈ نے تسلیم کر لیا۔ اس ایوارڈ میں مسلمانوں
کو ان کے اکثریتی صوبوں میں پچاس فی صد سے ایک یا دو نشستیں زائد دی گئی تھیں پنجاب کے
ہندوؤں نے متحد ہو کر چلانا شروع کیا کہ اسلام راج قائم کر دیا گیا ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ
گوردوارہ تحریک کی کامیابی سے کچھ زیادہ ہی منچلے ہو گئے تھے اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ
سے اعلان جڑ دیا کہ کمیونل ایوارڈ میں مسلمان راج کے جراثیم ہیں اگر اسے بدلا نہ گیا تو سکھ خون
کی ندیاں بہا دیں گے۔ ماسٹر جی نے سکھوں کو گورو گرنتھ پر حلف لینے کی تلقین کی اور ہر کہیں یہ
حلف اٹھایا گیا ——— شاہ جی انھی دنوں جیل سے رہا ہو کر آئے تھے ماسٹر جی کی

دھمکیاں پڑھیں تو امرتسر کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ماسٹر جی ہمیں اپنی پایاب ندیوں سے ڈراتے ہیں نہیں غالباً وہ اس سے بے خبر ہیں کہ ہم خون کے قلزم میں گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں۔"

شاہ جی کمر بستہ ہو کر نکل کھڑے ہوئے انھیں تحریکِ کشمیر کے تجربے نے ہندوؤں اور سکھوں کے اجتماعی ذہن نے پہلے ہی آزردہ کر رکھا تھا۔ ایک ایک شہر اور ایک ایک قصبہ کا چکر کاٹا تمام صوبہ میں شاہ جی کی شعلہ نوائی نے سحر کا کام کیا ماسٹر جی منتار زیر پر ہو گئے۔

## مرزائیت کا تعاقب

احرار کا دوسرا بڑا محاذ مرزائیت کے خلاف تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزی حکومت کی ایک خود کاشتہ طاقت کو ایک ایسی بے ڈھب جماعت سے واسطہ پڑا جس نے نہ صرف مسلمانوں میں اس کی تبلیغی طاقت زائل کر دی بلکہ اس کے برطانوی چہرے سے نقاب بھی الٹ دی اس مہم کی تائید میں بعض موثر آوازیں بھی اٹھیں۔ مثلاً علامہ اقبال نے مرزائیت کو کھلم کھلا مسلمانوں سے الگ ایک فرقہ قرار دیا پنجاب ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج جناب مرزا ظفر علی نے بھی مرزائیت کو آڑے ہاتھوں لیا اور حیدر آباد کے ایک فاضل مؤلف جناب الیاس برنی نے "قادیانی مذہب" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں مرزا غلام احمد سے لے کر مرزا محمود احمد تک کی تحریروں سے اُن کے مبادی و مقاصد مطالب و عزائم اور رجحانات و میلانات کا کچا چٹھا پیش کیا ——— اس پر مسلمانوں کی بعض تعلیمی انجمنوں کو فیصلہ کرنا پڑا کہ مرزائی ان کے اداروں کے رکن نہیں ہو سکتے ہیں۔

اس صورتِ حالات سے مرزائیت اور اُس کے اعوان و انصار گھبرا گئے۔ مرزا محمود احمد پیٹھ پیچھے خنجر بھونکنے میں یگانہ تھے۔ اُنھوں نے خنجر کو آستین میں رکھا اور

اور گھات میں بیٹھ گئے۔ اِدھر پنجاب کے اُمرا کا طبقہ جن کی خصوصیتیں اُوپر بیان ہو چکی ہیں، احرار کی تیز روی اور قبولِ عامہ کو اپنے لیے مُضر سمجھتا تھا۔ اس کے سامنے آئندہ کے الیکشن تھے۔ مُلک کو پہلی بار صُوبجاتی خود مختاری حاصل ہو رہی تھی۔ مُسلمانوں اور نامُسلمانوں کی طاقت میں دو یا تین ووٹوں کا فرق تھا۔ اُمرا نہیں چاہتے تھے کہ اس فرق سے فائدہ اٹھا کر احرار آگے بڑھیں اور اختیارات پر قابض ہو جائیں خود انگریز اس معاملہ میں پیش پیش تھے، کیوں کہ پنجاب بہر حال اُن کا قلعہ تھا۔

احرار بھی اس سے خالی الذہن نہ تھے ان کے پیشِ نظر بھی انتخابات تھے اور سمجھتے تھے کہ طاقت کے بغیر کوئی تنظیم بھی مؤثر نہیں ہوتی ——— عجب نہ تھا کہ وہ شہری اور قصباتی نشستوں میں سے بیس پچیس نشستیں بہ آسانی حاصل کر لیتے لیکن میاں سر فضل حسین مرحوم انہیں شہ مات دینے میں کامیاب ہو گئے گو وزارتِ عظمٰی کا خواب اُن کی ناگہاں موت سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا لیکن مرنے سے پہلے وُہ احرار کو شکست دے گئے۔ سر دار سکندر حیات نے ان کی جگہ لی جو پہلے تو احرار راہنماؤں سے دوستی گانٹھتے رہے لیکن میاں صاحب کا جانشین بنتے ہی نباہ نہ ہو سکا انھوں نے احرار کو فنا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی یہ تمام تفصیلات اس کتاب کا حصہ نہیں ہیں۔

## شہید گنج کا قضیہ

شہید گنج کا قضیہ ——— نامرضیہ اس ساری داستان کا ایک زود فراموش لیکن عبرت ناک باب ہے۔ شہید گنج پر ایک زمانہ سے سکھوں کا قبضہ تھا اور وہ اُس کو کسی صورت میں بھی مسجد تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ گوردوارہ شہید گنج کا ایک حصہ سمجھتے تھے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ میر منو گورنر پنجاب نے بعض سکھوں کو یہاں قتل کرایا تھا اور یہ ان کے مقتولین کی جگہ ہے ——— جب اکالی تحریک کے بعد گوردوارہ ایکٹ بنا اور اس ایکٹ کے بنانے میں میاں فضل حسین مرحوم و مغفور نے بھی اعانت کی۔ تو

شہید گنج کی ملکیت کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں نواب مظفر خاں بھی شریک تھے۔ نواب صاحب نے سکھوں کی ملکیت تسلیم کر لی مسلمانوں نے ایک دو بار چارہ جوئی کی لیکن بوجوہ ناکام ہوتے رہے ——— ان فیصلوں اور اپنے قبضے کے باوجود سکھوں نے انہدام مسجد سے احتراز کیا اب کئی سال بعد آغاز جولائی ۱۹۳۵ء میں ایکا ایکی مسجد گرائی جانے لگی تو مسلماں چونک اٹھے ہر طرف شور مچ گیا حتیٰ کہ دیکھتے دیکھتے شعلہ جوالہ بھڑک اٹھا اس بارے میں اب کوئی راز نہیں رہا کہ:

"شہید گنج لاہور میں ہے اور لاہور پاکستان ہیں جن لوگوں نے اس وقت شہید گنج کی بازیابی کے لیے ڈرامہ کھیلا تھا اُن میں سے ننانوے فی صد بقید حیات ہیں لیکن ہندوؤں اور سکھوں کے کامل انخلا کے باوجود شہید گنج پر پولیس کا سنتری پہرہ دیتا ہے کسی کو اُس کے مسجد ہونے کا خیال نہیں اور نہ کسی طرف سے کوئی آواز ہی اٹھتی ہے جہاں تک حکومت کی بین الملکی مصلحتوں کا تعلق ہے، اُن کی صحت میں کلام نہیں لیکن سوال اُن لوگوں کا ہے جو اس وقت شہید گنج کی بازیابی کے نام پر سیاسی ناٹک کھیل رہے تھے۔"

بہرحال ان اسرار سربستہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ا۔ مسجد حکومت کے ایما اور سر ہربرٹ ایمرسن گورنر پنجاب کی شہ پہ گرائی گئی۔ حکومت نے کرین مہیا کی۔ جس شخص نے سب سے پہلے مسجد کے گنبد پر کدال چلائی وہ پنجاب سی آئی ڈی کا ایک سکھ سب انسپکٹر پولیس تھا اس کی رپورٹ کا خلاصہ ایک مسلمان انسپکٹر پولیس کی معرفت مولانا ظفر علی خاں کے پاس پہنچا وہاں سے راقم الحروف کے ہاتھ لگا۔

——— چند سوشلسٹ نوجوان اس الزام میں ماخوذ تھے کہ انھوں

نے شہید گنج کے انہدام کا ذمہ دار حکومت کو گردانا تھا۔ ان کے خلاف ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ ان نوجوانوں نے راقم الحروف کو صفائی میں طلب کیا۔ راقم نے عدالت میں ذاتی حفاظت کا سوال اٹھایا۔ عدالت نے حکام بالا سے مشورہ کیا۔ حکومت کے کارندوں کا ضمیر اس معاملہ میں مجرم تھا۔ انھوں نے انکار کیا اور شہادت نہ ہو سکی مگر یہ بات لیل و نہار کی ہزاروں گردشوں کے باوجود جوں کی توں ہے کہ انہدام مسجد میں اس وقت کے انگریز گورنر اور سفید فام بیوروکریسی کا پورا پورا ہاتھ تھا۔

۲۔ سکھوں میں داخلی طور پر دو دھڑے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا گوردوارہ پربندھک کمیٹی پر قبضہ تھا جو لوگ اندر خانے ان کے دھڑے کو شکست دینا چاہتے، اور آئندہ انتخابات میں اپنی کامیابی کے لیے پر تول رہے تھے۔ انھوں نے سرکاری سازش میں شریک ہو کر مسجد کے انہدام کا فیصلہ کیا۔ ماسٹر تارا سنگھ کو اس وقت خبر ہوئی جب مسجد کو گرایا جانے لگا۔ ماسٹر جی نے مولانا داؤد غزنوی سے صورتِ حالات سمجھنے کے بعد سردار منگل سنگھ کو لاہور بھیجا کہ مسجد گرانے والوں کو روکیں، مگر حکام نے انھیں ننڈے بازار کے نکڑ پر روک دیا تا آنکہ مسجد ہموار ہو گئی۔ اب کوئی سکھ لیڈر بھی انہدام مسجد کی مذمت سے سکھ قوم میں اپنی شہرت کھونے کو تیار نہ تھا۔ سب اکٹھے تھے۔ اس کا فائدہ یونی نسٹ پارٹی کے دست و بازو سر سندر سنگھ مجیٹھیا کو بھی پہنچا۔ وہ اپنے بعض ساتھیوں سمیت انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ غرض پنجاب میں وزارت بنوانے کا جو نقشہ انگریزوں کے ذہن میں تھا وہ کامل طور پر پروان چڑھا۔

۳۔ سر میاں فضل حسین ہندوستان میں مسلمانوں کی سامنتی سیاست کے سب سے بڑے

شاطر تھے احرار نے سر ظفر اللہ خاں کی مرکز میں نامزدگی پر میاں صاحب کو ہدف مطاعن بنا کر اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ تمام خاندانی کاسہ لیس جو احرار کے قبولِ عامہ سے خائف ہو کر اُن کے گرد جمع تھے، شہید گنج کے انہدام پر ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے آنِ واحد میں مجلس عمل بن گئی! ایک بساط پر کئی مُہرے جمع ہو گئے جو لوگ مخلص تھے انھیں دھوکے میں رکھا گیا۔ اُدھر احرار رہنما لاہور سے باہر تھے اُن کی غیر حاضری میں سازش کا اختیاری و غیر اختیاری لائحہ عمل تکمیل پا گیا ——— چال یہ تھی کہ کسی طرح احرار راستہ سے ہٹ جائیں، تحریک میں حصّہ لیں تو مارے جائیں۔ نہ حصّہ لیں تو پٹ جائیں یہ دونوں صورتیں ان کے لیے کربلا کا ایک میدان تھا اور انھیں مٹانے کے لیے متضاد و متبائن عناصر اکٹھے ہو گئے تھے۔

(ا) احرار کو شروع ہی سے نشانے پر رکھ لیا گیا جس سے مسجد کا حصول مؤخر اور احرار پر سب و شتم مقدم ہو گئے۔

ب — میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء کے مکان پر بہ شمولِ احرار مختلف حلقہ ہائے خیال کے لوگوں کی جو میٹنگ ہوئی اس میں انہدام مسجد کے خلاف حکم امتناعی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن مولانا اختر علی خاں نے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایس پرتاب اور سردار نندر سنگھ سٹی مجسٹریٹ کے وعدے پر اعتماد کیا ——— درخواست تحریری (؟) یا لسانی (؟) جیب میں رکھ چھوڑی اور مسجد مسمار ہو گئی۔

ج — جن مختلف الخیال عناصر نے احتجاج کا بیڑا اٹھایا تھا وُہ خرابی حالات کے خوف سے خود تجویز کر کے نظر بند ہو گئے، مگر مخلص نوجوانوں کو کئی "دردازوں" کی انگیخت پر گولیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ اس کی سب سے بڑی سیاسی ضرب احرار پر

بڑی اُن کے خلاف مسلسل واویلا شروع ہوگیا۔ اسی دوران میں ان لوگوں کو بھی صف آرا کیا گیا جو افسروں کے جاسوس اور سرکار انگریزی کے ساختہ پرداختہ تھے حضرت امیرِ ملت سیّد جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے اردگرد جن لوگوں کو مامور کیا گیا ان میں سے نوّے فی صد حکومت کے کارندے اور پنجاب سی، آئی، ڈی کے ایک سپرنٹنڈنٹ کی خدمت گزار جماعت کے فرد تھے۔

د۔ مجلسِ اتحادِ ملت پر ابتداً ان لوگوں کا عمل دخل رہا جو سی، آئی ڈی کے تنخواہ دار مخبر تھے اور حصولِ شہید گنج کے مقصد کی بجائے میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ (سی، آئی، ڈی) اور ایس پی نائب ڈپٹی کمشنر لاہور کی باہمی آویزش کے مہرے بنے ہوئے تھے ——— مولانا ظفر علی خان نظر بندی سے رہا ہو کر لاہور تشریف لائے تو مجلسِ اتحادِ ملت کے ڈرامہ کا نیا باب شروع ہوگیا۔ جنرل الیکشن سر پر تھا۔ مولانا عبدالقادر قصوری رحمۃ اللہ علیہ اور ڈاکٹر شیخ محمد عالم بھی احرار سے اپنا قرض چکانے کے لیے اتحادِ ملت کے نقیب بن گئے۔ اِدھر احرار شہید گنج کے ملبے میں بُری طرح دب چکے تھے چودھری افضل حق جن سے یونی نیسٹ انتہا خوف کھاتے تھے "فرضی شہیدوں" کی نمائش سے ہرا دیے گئے انتخاب کا پالا یونی نسٹوں نے مار لیا ڈاکٹر عالم شہید گنج کی اینٹوں کا نام لے لے کر کامیاب ہوئے مگر جیتنے کے فوراً بعد کانگرس میں چلے گئے وہاں دال نہ گلی تو لیگ کا رُخ کیا تاآنکہ خضر حیات اور قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ میں تصادم ہُوا تو خضر حیات کا ساتھ دیا آخر ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں ہار کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔

اس انتخاب کے بعد جب احرار کی سیاسی شکست مکمل ہوگئی اور عمومی شہرت کو دھکا

لگ چکا تو کسی نے شہید گنج کا نام تک نہ لیا۔ ملک برکت علی مرحوم نے بازیابی کے لیے مسودہ قرارداد پیش کرنا چاہا لیکن ایک دلچسپ افتاد مانع ہو گئی۔

اب احرار نے تحریکِ شہید گنج کے راہنماؤں کو للکارنا شروع کیا مولانا مظہر علی اظہر نے سول نافرمانی کا مصرع اٹھایا خود بھی قید ہو گئے اور کئی سو رضاکاروں کو بھی قید کرا ڈالا مگر بات نہ بنی۔ عوام کے ولولے مدت ہوئی مر چکے تھے جو لوگ مجلسِ اتحادِ ملت کے لیڈر تھے وہ مختلف افسروں کے ہاتھ میں کھلونا تھے اُن کا مشن پورا ہو چکا تھا شہید گنج کا حصول نہ اس وقت پیش نظر تھا، نہ اب ہو سکتا تھا ——— آخر سردار سکندر حیات نے زبان کھولی اور اعلان کیا کہ شہید گنج کا حصول بوجوہ دشوار ہے کیوں کہ اس ایک مسجد کے جبری حصول سے مسلمانوں کو وہ تمام معابد لوٹانے ہوں گے جن پر مسلمان بادشاہوں کے عہد میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں ———۔ اُن کے اس اعلان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا حتیٰ کہ اتحادِ ملتی لیڈر بھی آمنا و صدقنا پکار اٹھے۔

یہ اعلان کوئی نیا نہیں تھا بلکہ مستعار تھا۔ مولانا مظہر علی اظہر نے انہدامِ مسجد کے وقت جب ابھی مسلمان شہید نہیں ہوئے تھے، یہی دلیل دی تھی۔ مگر اس وقت سازشی لیڈر ماننے کو تیار نہ تھے اور سادہ دل عوام غیظ میں تھے۔ اب جانبین نے اپنا پینترا بدل لیا۔ احرار کہتے تھے آؤ مسجد لیں، داعی کہتے تھے سکندر حیات کی بات درست ہے۔

احرار کے لیے آزمائش کا یہ سب سے بڑا دور تھا ایک محدود ذہن کے سوا تقریباً سب لوگ ان سے کٹ چکے تھے تمام احرار راہنماؤں کو ایک شدید یلغار کا سامنا کرنا پڑا، گو رفتہ رفتہ انھوں نے اسٹیج پر قابو پا لیا اور اپنی بات بھی کہنے لگے، لیکن بہت کچھ کھو کر۔

اصلاً شہید گنج کے معاملہ میں ان سے ایک سیاسی غلطی ہو گئی اگر وہ اس میں حصہ لے کر اس کا رخ پلٹتے تو زیادہ مفید نتائج پیدا ہوتے انھوں نے کنارہ کشی اختیار کر کے حالات کا صحیح اندازہ

نہ کیا جس سے مار کھا گئے۔

احرار کی اس بربادی کا سب سے زیادہ فائدہ ایک خاص دائرہ میں مرزا محمود احمد نے اٹھایا۔ اس نے شروع سے آخر تک اپنی کوششیں جاری رکھیں جہاں کہیں اور جس طرح بھی احرار کو ضعف پہنچ سکتا تھا، اس نے اس میں رتی بھر کمی نہ کی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ۱۹۳۵ء میں مرزا محمود احمد کے خلاف مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کا فیصلہ ایک خطرناک محاکمہ تھا یہ فیصلہ چھ جون ۱۹۳۵ء کو سنایا گیا کوئی ایک ماہ بعد شہید گنج کا سانحہ پیش آ گیا۔ مرزا محمود احمد نے خلافِ احرار شرد لوں کی پشت پناہی کا بیڑا اٹھایا چنانچہ ایک روایت کے مطابق اُس نے اس مہم میں کئی لاکھ روپیہ صرف کیا مگر ایک منفی فائدے کے سوا مرزائیت کو کوئی اثباتی فائدہ نہ پہنچا۔ آج احرار کا ذہن ہی مرزائیت کے زوال کی سب سے بڑی علامت ہے۔

شاہ جی یار و اغیار کی ان نوازشوں سے دل برداشتہ بھی ہوئے اور ضرورتِ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کیا مگر قلباً یہ رائے قائم کر لی کہ الیکشن بہت بڑا فتنہ ہیں۔ آپ نے اس کے بعد بھی طوعاً یا کرہاً الیکشن میں حصہ لیا مگر اس بات کا ہمیشہ ہی اظہار کرتے رہے کہ الیکشن فتنۂ عظیم ہے انھوں نے جماعت کو الیکشن سے باز رکھنے کی ہر دفعہ کوشش کی لیکن جماعت کے "دماغ" اُن کی "زبان" کی پناہ تو لیتے تھے مگر اُن کے دماغ سے فائدہ نہ اٹھاتے تھے نتیجہ معلوم کہ انگریزی عہد کے آخری انتخابات (۱۹۴۶ء) میں اُن کے ساتھیوں نے اُن کی بات نہ مان کر جو زک اٹھائی اُس کا خمیازہ اس طرح بھگتنا پڑا کہ اُن پر ایک دوسری شہید گنج گر گئی —— حتیٰ کہ ان کے حقیقی کارنامے بھی انتخابات کی پے در پے شکستوں کے گرد و غبار میں دب کر کھلنڈروں کی گشدہ محبتوں کے آوارہ نغمے ہو گئے اور اب —— ؟

سفتے بر و از دل گزرد ہر کہ ز پیشم

من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

## دوسری جنگ عظیم

ابھی شہید گنج کے زخموں کا کھرنڈ باقی تھا کہ احرار نے آرمی بل کی مخالفت کا ڈول ڈالا۔ یہ بل یورپ کے جنگی امکانات کی وجہ سے سنٹرل اسمبلی میں زیر بحث تھا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے ڈینزگ پر حملہ کر کے دوسری عالمگیر جنگ چھیڑ دی۔ گویا احرار رہنما اسی دن کی راہ دیکھ رہے تھے۔ چودھری افضل حق نے چھ ماہ قبل ۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا احرار کانفرنس پشاور میں صدارتی ایڈریس پڑھتے ہوئے کہا تھا:

"جنگ قضائے مبرم بن کر مغرب کے سروں پر کرگس کی طرح منڈلا رہی ہے یہ نازک اور مغلوب قوموں کو خبردار ہونے کا اشارہ ہے برطانوی سرکار میدانِ جنگ میں پہلا گولہ گرنے سے پیشتر نیاز مندی کا نمونہ بن کر سامنے آئے گی احرار شہنشاہیت کی اس مصیبت کو غلاموں کے لیے رحمت خیال کرتے اور آئندہ جنگ کو ہندوستان دونیائے اسلام کے لیے حصولِ آزادی کا بہترین موقع سمجھتے ہیں ہمارا فرض ہو گا کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر برطانوی شہنشاہیت پر ضرب لگائیں۔"

چنانچہ احرار ہائی کمانڈ کا ایک فوری اجلاس ۱۲ ستمبر کو امرتسر میں منعقد ہوا جس میں فوجی بھرتی کے خلاف جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا ــــــــــ لیگ نے اس وقت تک پاکستان کا نصب العین اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کے ساڑھے چھ ماہ بعد جب بڑے بڑے احرار زعما جیل خانوں میں تھے لیگ نے لاہور کے سالانہ سیشن میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس کیا۔ اس وقت تک عامۃ المسلمین میں احرار کے جرأت مندانہ اقدام سے ہمدردی کا ذہن عام تھا۔ گو سول نافرمانی میں وہ اجتماعاً شریک نہ تھے لیکن "اشیرواد" دینے میں پیچھے بھی نہ تھے ــــــــــ کانگرس نے احرار کے اس

فیصلے کو عاجلانہ قرار دیا۔ سوشلسٹوں نے تعاون کی پیش کش کی اور ایک متحدہ محاذ بنانے کے لیے گفتگو بھی ہوتی رہی لیکن فوری گرفتاریوں سے مشترکہ محاذ کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

احرار کو اس عاجلانہ اقدام کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی مسلمان قرار داد پاکستان کے بعد انھیں بھول گئے کانگرس نے نظر انداز کیا بالخصوص پنجاب کے کانگرسی زعماء احرار کی بہ نسبت سردار سکندر حیات سے زیادہ قریب تھے۔ انگریزوں نے اپنے گماشتوں کی معرفت احرار کو طویل سے طویل سزائیں دے کر بزعم خویش خوار کیا جیلوں میں احرار قیدیوں کے ساتھ اخلاقی قیدیوں سے بدتر سلوک ہوتا رہا۔ گوجرانوالہ کے ایک ہندو مجسٹریٹ نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ احرار سے اخلاقی قیدیوں جیسا سلوک کیا جائے اس پر بڑے بڑے دیش بھگت منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے ایک موقع پر تو رائے بہادر مہر چند کھنہ نے جو آگے چل کر خان وزارت میں وزیر مالیات ہو گئے تھے گاندھی سے یہ بیان حاصل کیا کہ احرار کلہاڑی رکھتے ہیں جو تشدد کا نشان ہے، لہذا ان کا کانگرس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بیان کی آڑ میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو ایسے مہاپرشوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع ملا ——

الغرض احرار نے اس معرکہ میں سخت سے سخت اذیتیں سہیں ہر استبداد کو خندہ پیشانی سے قبول کیا حتیٰ کہ موت و حیات کے درمیان کوئی راہ باقی نہ رہ گئی چوہدری افضل حق جان لیوا مرض میں مبتلا ہو کر رہا ہوئے اور چند مہینوں ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا محمد گل شیر، صوفی عنایت محمد پسروری، احسن عثمانی، حکیم غوث محمد جالندھری اور راقم الحروف دو برس تک قید تنہائی میں رکھے گئے۔ چکی پیسنے کو دی گئی، حکیم صاحب سی کلاس کی خوراک سے دمہ کے دائمی مریض ہو گئے۔ احسن عثمانی نے بھوک ہڑتال کی تو اس کی مقعد میں نالی گھسیڑ کر اسے نڈھال کر دیا گیا آخر اس داخلی صدمہ کی تاب نہ لا کر وہ رہا ہوتے ہی موت کے منہ میں چلا گیا۔ راقم الحروف سے جو سلوک ہوتا رہا اس

کی اہمیت کا تذکرہ "پسِ دیوارِ زنداں" میں آ گیا ہے جو راقم کے ایّامِ اسیری کی سرگزشت ہے۔

———— چودھری صاحب کی موت کے بعد احرار کا سیاسی رُخ یکسر پلٹ گیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلائی تو احرار نے حکومتِ الٰہیہ کا ریزولیوشن پاس کر کے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ احرار نہ تو مسلم لیگ کے ہم خیال ہو سکے نہ کانگریس ہی کی تحریک میں حصّہ لینے کے لیے تیار تھے بلکہ یہ کہ احرار کے سبھی ممتاز کارکن جیل میں تھے۔ اور تو اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جو احرار کے ہمیشہ سے صدر چلے آتے تھے، ایک بے میعاد زمانۂ نظربندی دھرم سالہ جیل میں گزار رہے تھے۔

دراصل یہ احرار کے ایک ایسے ذہن کا اندازِ فکر تھا جو اینٹی برٹش ہونے کے باوجود کانگریس سے ہم آہنگ تھا۔

جنگ ختم ہو گئی اتحادیوں کو فتح ہوئی لیکن جن لوگوں کو ظالمانہ حد تک انگریز دشمن سمجھا جاتا تھا وہ مزید کچھ عرصہ کے لیے پابند بھی رہے اور زبان بند بھی۔ خود راقم الحروف اتحادیوں کی فتح کے ایک سال بعد تک پابند رہا۔

### مولانا محمد گل شیر کی شہادت

انہی دنوں احرار کو ایک اور وار سہنا پڑا۔ مولانا محمد گل شیر اپنے گاؤں جنڈ ضلع کیمل پور میں راتوں رات گولی سے شہید کر دیے گئے۔ اُن کے قاتلوں کا سُراغ آج تک نہیں ملا۔ بہرحال اُن کا قتل ایک سیاسی قتل تھا اور اُس کے پس منظر میں وہ تمام رُجحانات و مَیلانات تھے جن کا ذکر پنجاب کی خصوصیتوں کے ابتدائی ذکر میں آ چکا ہے ———— مولانا جب تک کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ تھے اور صرف واعظ تھے، اُس وقت تک کیمل پور، اٹک اور میانوالی وغیرہ میں بڑے لوگوں کی آنکھ کا تارا تھے۔ مدتوں احرار کی مخالفت کرتے رہے جب کوئی احرار لیڈر ان علاقوں میں جاتا تو آپ اس سے اگلے ہی دن اُس کا اثر زائل کرنے پہنچ جاتے آپ کی آواز میں بلا کا سوز اور خطابت میں

ایک طرح کا سحر تھا، جس پر ٹھیٹھ پنجابی مرتے تھے۔ غرض ان اضلاع کے عوام میں ان کا تھا
اثر تھا۔ ــــــــــ ۱۹۲۸ء میں حج کو گئے تو وہاں مدینہ منورہ میں خواب
دیکھا، حضور فرماتے ہیں احرار سے مل کر خدمتِ خلق کرو۔ مولانا فرماتے تھے، میں نے اپنی پچھلی
مخالفتوں سے توبہ کی اور آتے ہی احرار میں شمول کا اعلان کر دیا ــــــــــ کوئی
ایک سال بعد احرار نے فوجی بھرتی کے بائیکاٹ کی تحریک چلائی تو آپ بھی دو سال کے لیے
قید کر دیے گئے۔ آپ نے قید کا یہ زمانہ انتہائی شجاعت اور غیرت سے بسر کیا، معلوم ہوتا تھا
قرنِ اول کا کوئی صحابی راہِ خدا میں صعوبتیں برداشت کر رہا ہے ــــــــــ ادھر
علاقے کے خانوں کو احرار میں آپ کا شمول ناپسند تھا۔ اُدھر آپ نے اُن کے علاقوں میں
احرار کی شاخیں قائم کرنا شروع کر رکھی تھیں۔ ایک دو جگہ کسانوں اور خانوں میں مڈبھیڑ بھی
ہوئی، جن خوانین نے لوگوں کو شاہ جی کی میزبانی سے روک دیا تھا، وہ بھلا مولانا گل شیر کے
اس قبولِ عامہ اور دعوتِ احرار کو کیوں کر سہ سکتے تھے۔ ــــــــــ نتیجہ معلوم کہ مولانا
مہینوں ہی میں قتل کرا دیے گئے۔ ملک خضر حیات نے بطور وزیرِ اعلیٰ قاتلوں کی تلاش کے کئی
وعدے کیے لیکن سب دوشیزاؤں کی کنگریاں ثابت ہوئے، یا پھر پولیس افسروں کے ہلکے تبسم
میں گم، جس کے پیچھے سازش کی تہ بہ تہ کڑواہٹیں ہوتی ہیں ــــــــــ!

## چودھری صاحب کی موت

چودھری صاحب کی رحلت کے بعد احرار کے سیاسی فیصلے کئی ٹھوکروں کا شکار ہونے لگے۔ اول تو
اُنھوں نے کتابی نظریوں کو پیشِ نظر رکھا۔ دوم اُن کا اینٹی برٹش ذہن اتنا پختہ تھا کہ وہ سراپا
جذبات ہو کر رہ گئے تھے۔ انھیں اس امر کا اندازہ ہی نہ تھا، کہ سیاسیات میں حالات و واقعات
کی رفتار دیکھ کر فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ وہ دل سے سوچنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اُن کا جذبہ رفتہ رفتہ

ضد بن چکا تھا اور اس ضد کو پروان چڑھانے میں کوتاہ کار عناصر کی کاسہ لیسانہ روش کا ہاتھ بھی تھا جو قربانی و ایثار، جذبہ و اعتقاد اور ایمان و اخلاص میں تو ان سے کوسوں پیچھے تھے لیکن اثر و رسوخ، دولت و ثروت اور جاہ و منصب میں منزلوں آگے تھے۔

## ماضی مرحوم

احرار ۱۹۴۶ء میں بھی ۱۹۲۰ء (تحریکِ خلافت) کے زمانے میں گھوم رہے تھے حالانکہ زمانہ چھبیس برس آگے نکل چکا اور ایک قومی نظریہ پیدا ہو کر جوان ہو چکا تھا اُن کا اعتقاد ہنوز نظری سیاست پر تھا عام مسلمان عملی سیاسیات میں ڈوب چکے تھے انھیں تاریخ کے اس عمل سے کوئی واسطہ نہ تھا کہ قوموں اور ملکوں کی ساخت پرداخت میں خاص قسم کے معاشی حالات حصہ دار ہوتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ مسلمان عقیدت و اعتقاد کی باتیں تو اُن سے سُن کر خوش ہوتے تھے لیکن معاملات کے وقت اُن کا رُخ ان لوگوں کی طرف ہو جاتا تھا جو اُن کے حقوق و مراعات کا نام لیتے اور ہمسایہ قوم کی مسلمان آزاری کا ذکر چھیڑتے تھے۔ انگریز ملک کا دشمن تھا لیکن مسلمانوں کے ہاتھ اتنے بلند نہ تھے کہ وہ اس کی آستین سے دشنہ و خنجر نکال لیں۔ اُن کی نگاہیں روزمرہ کے اُن چھوٹے چھوٹے واقعات کو دیکھ کر خشمگیں ہوتی تھیں جن کا سرچشمہ ہمسایہ قوم کے لوگ تھے۔

## احرار اور لیگ

احرار کو غیر شعوری زعم تھا کہ وہ صُورتاً اور سیرتاً اسلام سے قریب ہیں ان کے ظاہر و باطن میں اس کے اثرات بھی تھے۔ لیکن لیگ کے راہنما مسلمان عوام کی روزمرہ کی زندگی میں گھس چکے تھے اور اُن کی طبعی خواہشات کو متشکل کر کے اُس کا نام پاکستان رکھ دیا تھا۔ پاکستان ابتداءً ہندوؤں سے مسلمانوں کی اجتماعی ناراضگی کا اظہار تھا۔ رفتہ رفتہ اُن کے اسلامی لیکن مادی تقاضوں کا مظہر بن گیا احرار اس کے مجوزین کی طبقاتی سیرت اور پیدائشی کردار کو زیرِ بحث لا کر اپنے جائز

خدشات کا غلط اظہار کرتے تھے انھیں اس سے غرض نہ تھی کہ مسلمان عوام کیا چاہتے ہیں وہ صرف اس سے بحث کرتے تھے کہ جن کی معرفت چاہتے ہیں وہ کون ہیں۔؟ چودھری افضل حق مرحوم نے انھیں آخری ایام زندگی میں متنبہ بھی کیا تھا کہ پاکستان کی مخالفت نہ کرنا دکھی دلوں کی فریاد ہے، لیکن ان کی جذباتی سیاست نے اپنے ہی قائد کی بات کو آویزۂ گوش بنانے سے انکار کیا ————

**وجہ مغائرت** ضد اس سے پیدا ہوئی کہ لیگ کے دولت مند اکابر ان کی غریبی پر طعن توڑتے اور انھیں ہندوؤں کا زر خرید کہتے تھے ظاہر ہے کہ ایک سچا دل گالیوں کی اس اجتماعی یلغار سے بگڑے گا۔ پھر یہ بگاڑ اس صورت میں اور بھی مضبوط ہوتا ہے جب گالی دینے والا خود گالی ہو، احرار نے کس مپرسی، غصے، جھنجھلاہٹ اور ضد میں پاکستان کے ملی موقف کی اہمیت کو نظر انداز کر کے نہ صرف لیگ کے راہنماؤں سے محاذ جنگ قائم کر لیا بلکہ اُس وقت انتخاب میں کود پڑے جب قومی مستقبل کے سوال پر انتخاب ہی نہیں، استصواب ہو رہا تھا۔

۱۹۴۶ء کے انتخاب میں حصہ لینا احرار کی سب سے بڑی غلطی تھی بعض اجزائے جماعت نے ضد میں اگر یونی نسٹوں کا ہاتھ بھی بٹایا جس سے احرار کے اجتماعی وقار کو سخت دھکا لگا لیکن اس میں عام احرار یا عام اکابر کا کوئی حصہ نہ تھا، چودھری صاحب کی موت کے بعد احرار کے قائد مولانا مظہر علی اظہر تھے جن کا انفرادی ذہن احرار کا جماعتی ذہن سمجھا جاتا تھا ————

چونکہ احرار رہنماؤں میں سیاسی اصولوں کے بجائے ذاتی دوستیوں کا میلان ہی غالب رہا اس لیے ایک کی بات پر سب ملوحاً یا کرہاً سر جھکا دیتے تھے ———— شاہ جی "انتخابی یدھ" میں حصہ لینے کے سخت خلاف تھے جب جماعت نے فیصلہ کیا اور مولانا مظہر علی اظہر نے پہلی انتخابی تقریر کی تو شاہ جی سری نگر میں تھے۔ آپ مولانا کی تقریر کے ایک ماہ بعد لاہور تشریف

لائے تو نہ صرف انتخاب لڑنے کے فیصلے پر ناراض ہوئے بلکہ مولانا مظہر علی اظہر سے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ "آپ نے سیاسیات میں ذاتیات کو لا کر ایک بُری مثال قائم کی ہے۔ براہ کرم آئندہ اس موضوع سے پرہیز کیجئے۔" ـــــــ اب کوشش یہ کی گئی کہ شاہ جی بھی انتخابی مہم میں حصہ لیں۔ شاہ جی نے یونی نسٹوں پر تو تبرّیٰ بھیجا، لیکن بہ منت اس پر راضی ہو گئے کہ صرف آزمودہ احرار اُمیدواروں ہی کے حلقہ ہائے انتخاب میں جائیں گے۔ اُس زمانے میں آپ نے جو تقریریں کیں اس میں مستقبل کے خدشات بالتفصیل بیان کیے، لیکن لٹک اور کھٹک کا وہ انداز ناپید ہی رہا جو زبان و دل کے متحد ہونے سے پیدا ہوتا ہے ؎

ہزار خوف ہوں، لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

انتخاب میں احرار کو ناگزیر شکست ہوئی۔ اُن کا ایک اُمیدوار بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ تھوڑے دنوں بعد شاہ جی کو بعض ناگفتہ بہ حقائق کا پتہ چلا تو سخت دل برداشتہ ہوئے بلکہ بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

ادھر وزارتی مشن ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ احرار راہنماؤں کا وہ قبیلہ جس کی دوستی قابلِ رشک سمجھی جاتی تھی اپنے اندرونی اختلاف کے باعث بٹنے اور بکھرنے لگا۔

مولانا ظفر علی خاں اور غازی عبدالرحمٰن ۱۹۳۱ء ہی میں الگ ہو گئے تھے وہ صرف نیو اُٹھانے میں شریک ہوئے تھے اور بس۔ تحریکِ شہید گنج کے بعد مولانا داؤد غزنوی نے بھی ذہنی علیحدگی اختیار کر لی اور ۱۹۴۰ء کے وسط میں کانگرس میں چلے گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے رہا ہوتے ہی شملہ کانفرنس کے موقع پر اعلان کر دیا کہ اُن کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ احرار سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ تقسیم ہندوستان کے بعد انھوں نے دہلی میں مستقلاً سکونت

اختیار کر لی بھارتی شہری ہو گئے اور اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ——————

مولانا مظہر علی اظہر نے وزارتی مشن کے زمانے میں احرار سے استعفا دے دیا اور انفرادی طور پر پاکستان کی حمایت کرنے لگے پاکستان بنا تو شاہ جی نے جماعت کے نام ایک خط لکھا کہ احرار کو اپنی سیاسی حیثیت ختم کر دینی چاہیئے کچھ دنوں بعد احرار کا ایک ایسا گروہ لیگ کی طرف راجع ہونے لگا جس میں سیاسی شکست خوردگی کا احساس نمایاں تھا۔ غالباً مارچ ۱۹۴۹ء میں ایک کھلی کانفرنس منعقد کر کے احرار نے لیگ میں ادغام کا اعلان کیا اور جماعت تبلیغی بنا دی گئی اس تبلیغی تنظیم نے قادیانیت کی سرکوبی شروع کی رفتہ رفتہ پاکستان کے سبھی علماء ہم نوا ہو گئے اس ہمنوائی نے قادیانیت کے خلاف ایک منضبط محاذ کی صورت پیدا کی فروری ۱۹۵۳ء میں "راست اقدام" کی آگ بھڑک اٹھی حکومت کو لاہور میں مارشل لا نافذ کرنا پڑا —————— اور آخر دسمبر ۱۹۵۴ء میں حکومت پنجاب نے مجلس احرار کو خلاف قانون قرار دے کر اس کے سارے سامان پر قبضہ کر لیا اور دفاتر سر بہ مہر کر دیئے —————— تا دم تحریر مجلس احرار خلاف قانون ہے احرار کے جدید راہنماؤں میں کوئی بھی اس کی حیات نو کے لیے مضطرب نہیں جو لوگ مذہبی اور دینی مزاج و طبیعت رکھتے ہیں انھوں نے شاہ جی کی قیادت میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی بنا ڈال رکھی ہے اور قادیانیت کے خلاف سرگرم جہاد ہیں جن کے پیش نظر شروع سے امور سیاسیات تھے وہ عوامی لیگ میں چلے گئے ہیں —————— لیکن جماعت کے خلاف قانون ہونے پر بھی احراری ذہن علی حالہٖ قائم ہے پنجاب کے شہروں میں نہ صرف اس کے مضبوط حلقے ہیں بلکہ سیاسی طور پر بھی ان میں ایسا استحکام اور انضباط ہے جس نے حوادث و افکار کی طویل گردشوں کے بعد ایک قبیلوی عصبیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے —————— مندرجہ بالا تصریحات کا تجزیاتی خلاصہ یہ ہے:۔

**خلاصۂ احرار** ۱۔ احرار پنجاب کے ادنیٰ متوسط طبقے کے شہریوں کی ایک دیسی تحریک تھے،

جس میں جوش و جذبہ وافر تھا۔ وہ لیگ کے ہمہ گیر سیاسی ذہن کے مقابلہ میں ایک مذہبی جماعت تھے اور کانگرس کی ہمہ گیر تنظیم کے مقابلہ میں ایک محدود سیاسی ذہن۔ ان کے پیروکار ادنیٰ درمیانے درجہ کے شہری لوگ تھے۔

۲۔ ان میں سیاست کی یکرنگی کے بجائے رفاقت کی ہم رنگی کا جذبہ کارفرما تھا۔

۳۔ خود داخلی طور پر متضاد الخیال تھے لیکن اینٹی برٹش ذہن کی مشترکہ چھاپ نے انھیں ایک کر رکھا تھا۔

۴۔ جن طاقتوں کے خلاف صف آرا تھے اُن کی مختلف الاصل جارحیت کے خلاف مذہبی زبان میں سیاسی اثر پیدا کرتے تھے۔

۵۔ مسلم لیگ کے فروغ سے پہلے اور خلافت کمیٹی کی رحلت کے بعد مسلمانوں میں مضبوط ترین عوامی جماعت تھے لیکن بہمہ وجوہ اپنا کوئی واضح سیاسی پروگرام نہ تھا ایک خاص قسم کے تضاد کا شکار تھے۔

۶۔ جماعت کا وجود کانگرس اور جمعیۃ العلماء کی منشا کے خلاف تھا اور یہ دونوں جماعتیں احرار سے کسی حال میں بھی متفق نہ ہوتی تھیں مگر اکابر احرار میں سے بیشتر کانگرس اور جمعیۃ العلماء کے ذہن کی سفارت کرتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی سے ایک گونہ عقیدت رکھتے اور اُن کی ذات کے لیے بردا کرنا ہوتے تھے گویا سیاست و مذہب کے میدان میں انھیں اپنے ثانوی ہونے کا اقرار تھا۔

۷۔ انھوں نے ہندوستان کی قومی تحریک میں للّٰہی جذبے سے بے مثال قربانیاں کیں حتیٰ کہ اپنی عمروں کا بیشتر حصہ جیلوں میں گلا دیا، لیکن کانگرس اور لیگ دونوں نے صرف نظر سے کام لیا، جب وہ برطانوی حکومت کے خلاف کانگرس کے ذہن کی تائید کرتے تو مسلمان

بدکتے تھے اور جب مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے تو کانگریسیوں کو ناگوار گزرتا تھا اور جب مدح صحابہ ایسی تحریک میں رہنمایانہ حصہ لیتے تو خود مسلک مسلمانوں میں مذہبی دیوانوں کا خطاب پاتے تھے ـــــ الغرض انگریز، ہندو اور مسلمان تینوں اپنے دوائر میں ان کے خلاف تھے۔

۸- احرار کسی بھی تخلیقی فکر کے مظہر نہ تھے مگر ایجی ٹیشن اور پراپگنڈا کے فن میں بے مثال تھے۔

۹- ان کے نظریات میں رُوحانی تضاد تھا مثلاً سیاست میں اینٹی برٹش ذہن کے وارث، مذہب میں حکومت الٰہیہ کے مبلّغ، ثقافت میں اسلامیات کے دلدادہ، معاشیات میں دولت کی برابر تقسیم کے داعی، غرض ان کی تقریروں کا اوڑھنا بچھونا قرآن و حدیث اور تاریخ و سیرت کا مرکب ہوتا تھا اور مذہب ہی کے نام پر وہ مسلمانوں سے مخاطب ہوتے تھے۔

۱۰- انھوں نے احتجاجی سیاسی ذہن پیدا کیا لیکن تنظیم نہیں، چودھری افضل حق مرحوم سے زندگی وفا کرتی تو ممکن تھا وہ تنظیم کو خدائی خدمتگار تحریک کے ہم پایہ بنا لیتے ـــــ لیکن ان کی موت کے بعد جماعت کا یہ پہلو کمزور ہو گیا ـــــ کیونکہ شاہ جی جھنجھوڑ تو سکتے تھے، جوڑ نہیں سکتے تھے۔

۱۱- احرار نے ساری زندگی شہروں یا قصبوں کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائے رکھا۔ دیہات کا رُخ انھوں نے دیر بعد کیا، لیکن تبلیغی حیثیت سے مثلاً مرزائیت کے خلاف، اصلاح الرّسوم کے تحت بدعات کی بیخ کنی کے لیے، یا پھر سیرت کے جلسوں میں!۔

خود شاہ جی مدت ہائے مدید تک لوگوں کو السلام علیکم کہنا سکھاتے پھرے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے مسائل پر مسلسل وعظ کیے ـــــ مگر لوگوں کے معاشی یا مجلسی مسائل کو تنظیمی اعتبار سے چھوا تک نہیں البتہ پنجابی مسلمانوں کو تجارت کی راہ پر لانے میں شاہ جی اور احرار کا قابلِ ستائش حصہ ہے۔

۱۲- احرار میں قربانی، احتجاج، حوصلہ اور خطابت کا جوہر وافر تھا لیکن فکر، نظر، کسوٹی اور قیادت کا تناسب مقابلتاً کمتر تھا۔ انھوں نے زمانے کے مطابق چلنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ اُن میں سپاہی ہی سپاہی تھے لیکن مدبر الشاذ کالمعدوم ——— وہ ہنگامہ کے ایک لمحہ کو مصلحت کی سو سالہ زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ میدان میں بلا کے لڑ دیے تھے لیکن سیاست دان نہیں تھے۔

۱۳- ان کی سب سے بڑی کمزوری وسائل کا قحط تھا جو کچھ تھے اپنے اندر ہی تھے اُن کی سپلائی کی لائنیں کسی رُخ پر نہ تھیں۔ وہ فقر و فاقہ اور جوش و غضب کا ہراول دستہ تھے۔

۱۴- اُنھیں امراء کے ذہن سے حد درجہ عناد تھا اس عناد ہی کا نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے تحریکِ پاکستان کو عوام کے بجائے خواص کے آئینہ میں دیکھا اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ:

"جن لیگیوں اور کانگریسیوں کو سیاسی اور اقتصادی مساوات سے گھن آتی ہے، وہ سُن لیں کہ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں نہ وطنی بھائی بلکہ وہ لٹیروں کا ذہن رکھتے ہیں اُن کا اور احرار کا ساتھ نبھ نہیں سکتا ——— ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تم تقسیم ہند کے قائل ہو؟ ہم اس سوال کا جواب دینے سے قبل سائل سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم دولت کی منصفانہ تقسیم کے قائل ہو؟ اگر قائل ہو تو پھر ہندوستان ایک طرف رہا ہم شہروں کی تقسیم کے بھی قائل ہیں لیکن ہم اس کے سخت خلاف ہیں کہ لاکھوں مسلمانوں کی قربانی دے کر کسی یزید جیسے مسلمان کے لیے تختِ سلطنت بچھایا جائے ———" (تاریخ احرار صفحہ ل م)

جان گنتھر کے نزدیک احرار مذہبی اعتبار سے فرقہ پسند فدائی اور سیاسی اعتبار سے انتہا پسند سیاسیین تھے لیکن Modern Islam in India کے مصنف

مسٹر Wilfred C. Smith کا خیال تھا کہ احرار ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کی پہلی مسلم سوشلسٹ تحریک تھے۔

ان محاسن و معائب کے پس منظر میں احرار کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے اور صدمہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تحریک کس بے دردی سے برباد ہوگئی —— —— لیکن ایک مؤرخ واقعات کی چھان پھٹک کے بعد اس نتیجہ پر ضرور پہنچتا ہے کہ احرار نے جس ذہن کی آبیاری کی اُس کی بہت سی شاخیں ثمر آور ہیں۔ مثلاً:

۱۔ مسلمان نوجوانوں میں خصوصیت سے خلافِ سامراج ذہن پیدا کیا جو پختہ ہو کر فطرت ہو گیا۔ اِس سے متاثر ہونے والے زیادہ تر درمیانے درجے کے مفلوک الحال لوگ تھے۔

۲۔ غریبوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس کا ذہن مسلمان اُمرا کے استحصالات سے برافروختہ ہو کر طبقاتی شعور کی راہ پر آگیا۔ اس جماعت کا وجود بازارِ سیاست میں خرید و فروخت سے ہمیشہ نادری رہا۔

۳۔ مسلمانوں میں فعال سیاسی کارکنوں کی ایک کھیپ پیدا ہوگئی جس کا عام حالات میں قحط تھا۔

۴۔ مسلمانوں میں اچھے مقرروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جس نے ذہنی انقلاب کی آبیاری میں قابلِ قدر حصہ لیا۔

۵۔ عام لوگوں کی چمڑی میں سے استحصالی گروہ کا خوف جاتا رہا۔ غربا میں احساسِ خودی توانا ہونے لگا۔

۶۔ مسلمانوں میں پہلے کی بہ نسبت کئی سو گنا بدعات کا خاتمہ ہوگیا، اور وہ بعض معاشرتی گمراہیوں سے بچ نکلے۔

—— ہم میں سے بے شمار لوگ —— تنابعی اعتبار سے

ننانوے فی صد لوگ، بلاشبہ اس طبقاتی ذہن کو احرار کا پیدا کیا ہوا ذہن تسلیم کرنے سے ہچکچائیں گے، کیوں کہ تاریخ شکست خوردہ لوگوں سے کبھی اِنصاف نہیں کرتی لیکن یہ ذہن، (بغیر نام) بہر حال پاکستان کے مستقبل کا ذہن ہے؟

---

# مرزائیت

## پاکستان سے پہلے!

مسلمانوں اور مرزائیوں میں ٹکراؤ کی جو صورتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ اُن کی بنیاد اُس دن رکھی گئی جب ۱۸۸۰ء میں مرزا غلام احمد نے اپنے "مُلہم مِنَ اللہ" ہونے کا دعویٰ کیا۔[۱] اسی سال آپ نے "براہینِ احمدیہ" لکھی جس میں اپنے مجدد ہونے کا اعلان کیا۔ یکم دسمبر ۱۸۸۸ء کو آپ نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں اپنے مسیحِ موعود ہونے کا "انکشاف" کیا اور "ظلّی نبی" کی مصطلح ایجاد فرمائی۔ ۴ نومبر ۱۹۰۴ء میں آپ نے سیالکوٹ کے ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے "مثیلِ کرشن" ہونے کا دعویٰ کیا، پھر فرمایا کہ آپ ہر مذہب کے لیے اوتار ہیں۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔

اس اثنا میں (۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک) تصادم و تکرار کا جو بیج بویا گیا اُس کے برگ و بار کا خلاصہ یہ ہے:۔

---

[۱] دیکھو ریویو آف ریلیجنز بابت مئی ۱۹۰۶ء نمبر ۵ جلد ۵ صفحہ ۱۶۴

اوّلاً آپ نے عیسائی مشنریوں سے مناظروں کی بنا رکھ کر مسلمانوں کی ذہنی زندگی کو ایک ایسے اُلجھاؤ میں پھنسا دیا جس کا بدیہی نتیجہ اِن حالات میں انگریزی حکومت کی مصلحتوں کے لیے نفع آور تھا۔

ثانیاً آریہ سماجیوں سے تُو تکار کی راہ پیدا کی چنانچہ سب سے پہلا مناظرہ آپ نے اوائل مارچ ۱۸۸۶ء میں لالہ مرلی دھر آریہ سماجی سے ہوشیار پُور کے مقام پر کیا جس میں پہلی دفعہ اُس دُشنام و تعریض کی بنا رکھی گئی جس نے آیندہ چل کر راجپال ایسے شاتم رسُول پیدا کیے جو برطانوی اغراض انتشار کے پیشِ نظر مرزا صاحب کے مُباہلوں کا قدرتی نتیجہ تھا۔

ثالثاً علما کے ایک گروہ میں ظلّی نبوّت کے دعوٰی کی مزاحمت شروع ہو گئی مولوی محمد حسین بٹالوی جو مرزا صاحب کے دعوٰی نبوّت سے پہلے عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے اور تنسیخ جہاد کی جد وجہد میں آپ کے ساتھ تھے ایکا ایکی فرنٹ ہو گئے۔ عام مسلمانوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا چنانچہ جن لوگوں کو آپ کے خد و خال کا قریبی علم تھا انھوں نے آپ پر جوابی فتوے صادر کیے یہ فتوے پہلے پہل ۱۸۹۰ء میں صادر کیے گئے۔ سب سے پہلا فتوٰی لُدھیانہ کے علما نے جاری کیا جن میں مولانا محمد عبد اللہ اور مولانا عبد العزیز رحمہما اللہ تعالیٰ پیش پیش تھے۔ اُن کی تائید میں مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نے فتوٰی صادر کیا پھر دہلی، آگرہ، حیدر آباد اور بنگال کے عُلما نے فتاوٰی جاری کیے تا آنکہ مرزا صاحب کی مہدویّت اور نبوّت نزاع کا باعث ہو گئی دونوں طرف مباحثوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اس پر مرزا صاحب نے ظلّی نبوّت کے جو کمالات دکھائے، اُس کی فصاحت و بلاغت کے نمونے آیندہ صفحات میں ضمنی مباحث کی مناسبت سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

**مُقدّمہ بازی**

ان مباحثوں اور مُباہلوں کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ نوبت مقدمہ بازی تک جا پہنچی۔ سب سے پہلا مقدمہ پادری کلارک نے کیا جس میں الزام لگایا گیا کہ مرزا

صاحب نے اپنے کسی الہام کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ایک شخص عبدالحمید کو اُن کے قتل پر مامور کیا ہے۔ دوسرا مقدمہ پولیس نے ۱۸۹۸ء میں ایک پیشین گوئی کی بنا پر دائر کیا جس میں مولانا محمد حسین بٹالوی کے رشتۂ حیات منقطع کیے جانے کا اشارہ تھا۔ اسی طرح ۱۹۰۲ء کے آخر میں ایک مسلمان نے جہلم میں دو مقدمے دائر کیے مگر ہر مقدمہ میں مرزا صاحب بری ہوتے گئے۔ البتہ آریوں سے مناظروں میں بدگوئی کی سزا مرزا صاحب کے بجائے اسلام کو بھگتنی پڑی چنانچہ ستیارتھ پرکاش کا پہلا ایڈیشن جو ۱۸۷۵ء میں راجہ جے کشن داس سی۔ ایس۔ آئی کے زیرِ اہتمام بنارس میں چھپا تھا اور جس کے حقوق سوامی دیانند نے اُن کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے ابتداءً بارہ ابواب پر مشتمل تھا۔ اس میں تیرھویں اور چودھویں باب کا اضافہ مرزا صاحب کی ان تحریروں کے بعد ہوا، جن میں آریوں کے نیوگ ایسے معاشرتی مسئلے کو چھیڑ کر اُن کا مذاق اُڑایا گیا، اور اُن کے بعض عقائد کو مضحک قرار دیا گیا تھا۔ سوامی دیانند ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو انتقال کر گئے تو مرزا صاحب نے اُن کی موت کو بھی اپنی پیش گوئیوں سے وابستہ کر لیا۔ چنانچہ ان کی رحلت کے بعد ستیارتھ پرکاش کا جو دوسرا ایڈیشن چھپا اس میں تیرھویں اور چودھویں باب کا اضافہ تھا جن میں خدا و رسولؐ پر رکیک حملے کیے گئے تھے[1]

غلام احمد کو اُن کی زندگی ہی میں، ان دعویٰ ہائے مہدویت اور نبوت کی بنا پر گھیر لیا گیا، گو پڑھے لکھے لوگوں میں اُن کے دعاوی کو محض مخرِیّن سے تعبیر کیا گیا مگر عام مسلمانوں نے ان دعاوی سے اجتماعاً کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس سلسلہ میں مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بڑا نام پیدا کیا، لیکن مرزا صاحب کی وفات کے بعد اصل خرابی مرزا محمود احمد کے عہد میں شروع ہوئی جب حکیم نور الدین خلیفہ اول کا انتقال ہو گیا اور مرزا محمود احمد مصلح موعود کا لبادہ اوڑھ کر بزعمِ خویش عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ بن بیٹھے

---

[1] اس انکشاف کی پوری حقیقت آپ مولانا مظہر علی اظہر کی کتاب ستیارتھ پرکاش اور مرزا غلام احمد سے معلوم کر سکتے ہیں۔

—————— چنانچہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) سے لے کر دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے آغاز تک مرزائیت ایک بندھی اور لپٹی ہوئی چیز کی طرح خود بخود کھلتی اور بکھرتی چلی گئی۔ عامۃ الناس کو رفتہ رفتہ معلوم ہوتا چلا گیا کہ مرزائیت کا مافی الضمیر کیا ہے؛ اور اس کے ظاہری و باطنی وجود میں کس قدر تفاوت یا مطابقت ہے؟ حکیم نورالدین کی حیات تک عام لوگوں میں اس کا تبلیغی کردار ہی نمایاں رہا، لیکن مرزا محمود احمد کی خلافت نشینی نے چہرے کی تمام نقابیں اٹھا دیں اور لوگ غالباً پہلی دفعہ پہچاننے لگے کہ اس تبلیغ کے پس منظر میں جو تنظیم قائم ہوئی ہے اس کو ایک تحریک بنانے میں کن عوامل و عناصر کا ہاتھ ہے —————— چنانچہ پہلی جنگ عظیم میں اتحادیوں بالخصوص انگریزوں کی فتح پر اس تحریک یا تنظیم نے جو کارنامے سرانجام دیے اور خلافت عثمانیہ کے سقوط پر جس مسرت کا اظہار کیا اس سے مسلمانوں کے کان کھڑے ہو گئے اور مسلمانوں کی سیاسی تحاریک کے دینی راہنماؤں نے پہلی دفعہ مرزائیت کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ شروع کیا۔

## مولانا ظفر علی خاںؒ کی مزاحمت

اس وقت تک مرزا غلام احمد کے بارے میں عوام و خواص کی معلومات زیادہ تر سماعی تھیں اور لوگ انہیں یا اُن کی جماعت کو بوجوہ ایک تبلیغی جماعت ہی سمجھتے تھے لیکن اسلامی ملکوں کی تاخت و تاراج پر مرزائیوں نے جو چراغاں کیا اس سے عام مسلمان نہ صرف برگشتہ ہو گئے بلکہ مرزائیت کا توڑ قرآن و حدیث سے کیا جانے لگا، یعنی ابتدا میں مرزائیت کی سیاسی کارگذاریوں کو بوجوہ چیلنج نہیں کیا گیا بلکہ اُس کی مذہبی عمارت کو ڈھانے کے لیے صرف مذہب ہی کو واسطہ بنایا گیا، لیکن رفتہ رفتہ مزاحمت کا جو ذہن تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے داعیٔ اوّل مولانا ظفر علی خاں مدیر زمیندار تھے جنھوں نے مرزائیت کے خلاف جمہور المسلمین میں ہنگامہ برپا کر دیا اور مرزائیت کو شہروں سے بھاگ کر دیہات کی پناہ لینی پڑی مولانا ظفر علی خاں نے تردید مرزائیت کے ضمن میں بعض طویل اور

گراں قدر مقالے لکھے۔ جو غالباً ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں بعض فکاہی نظموں کے ساتھ "ارمغانِ قادیان" کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے، کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی تمام جلدیں مرزائیوں نے اپنے ایجنٹوں کی معرفت خرید کر جلا دیں اور مولانا اختر علی خاں کو اشاعتِ ثانوی سے باز رکھنے کے لیے رام کر لیا گیا اسی اثنا میں مولانا ظفر علی خاں کی پیدا کی ہوئی عوامی تحریک کو اسی جوش و ہیجان کے ساتھ بعض سیاسی اور دینی حلقوں نے بھی اپنانا شروع کیا چنانچہ چودھری افضل حق مرحوم نے بعض تلخ سیاسی تجربات کی بنا پر احرار رفقا کو آمادہ کیا کہ وہ اس تحریک کو ہاتھ میں لے کر قادیانیت کی اجتماعی مضرتوں کا جماعتی مقابلہ کریں۔

## احرار کی جماعتی مزاحمت

شاہ جی نے میدانِ مبارزت کی کمان سنبھال لی اُسی کا نتیجہ تھا کہ مرزائیت کو پہلی دفعہ ایک سخت جان طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا جس کی پاداش میں احرار کو صعوبتوں پر صعوبتیں سہنی پڑیں حتیٰ کہ مذہب کے اس محاذ کا خمیازہ اُنھوں نے سیاسی محاذ کی پے در پے ناکامیوں میں بھگتا مگر مسلسل مزاحمت کے باوجود مرزائیت اور اُس کے پیروؤں کو ایک ایسی پوزیشن میں لاکر کھڑا کیا کہ :

۱۔ عام مسلمانوں میں اُن کا وجود ہر اعتبار سے مخدوش ہو گیا۔

۲۔ اُن کے تبلیغی دروازے بُری طرح بند ہونے لگے۔

۳۔ اُنھیں مذہباً اچھوت سمجھا جانے لگا، اور سیاستہً برطانوی اقتدار کا مُہرہ جس کا اقرار خود مرزا محمود احمد نے اپنے بہت سے خطبوں میں کیا ہے۔ مثلاً :

"ہماری جماعت وُہ جماعت ہے جسے شروع ہی سے لوگ کہتے چلے آئے ہیں کہ یہ خوشامدی اور گورنمنٹ کے پٹھو ہیں بعض لوگ ہم پر یہ الزام لگاتے

ہیں کہ ہم گورنمنٹ کے جاسوس ہیں پنجابی محاورہ کے مطابق ہمیں "جھولی چک"
اور نئے زمینداری (غالباً اخبار "زمیندار" مراد ہے) محاورہ کے مطابق ہمیں
"ٹوڈی" کہا جاتا ہے"..... (خطبہ مرزا محمود احمد "الفضل" قادیان جلد نمبر ۲۲
نمبر ۵۸ مورخہ ۱۱- نومبر ۱۹۳۴ء)

۴- احرار کی مزاحمت سے پہلے جدید پڑھے لکھے مسلمانوں کی ایک جمعیت مرزائیوں کے تبلیغی جلسوں میں شریک ہو کر اُن کی بالواسطہ تقویت کا موجب ہوتی تھی جس سے ناخواندہ مسلمانوں میں اُن کا مذہبی اعتبار بڑھتا تھا۔ اب وُہ نقشہ ہی پلٹ گیا حتیٰ کہ مسلمان خواص کو بھی جمہور کی ناراضی کے پیشِ نظر ان کی معاونت سے دست کش ہونا پڑا۔

۵- مسلمانوں نے مرزائیوں کو اپنے بیشتر اداروں سے نکال باہر کیا اور عام انتخاب میں اُن کے چناؤ کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔

۶- سب سے بڑی جیت یہ ہوئی کہ دورِ حاضر کے سب سے بڑے مسلمان مفکر علامہ اقبال ؒ نے قادیانی تحریک کے مالۂ و ماعلیہ کا مطالعہ کر کے اُس کا تجزیہ کیا چنانچہ مرزائیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دینے کی تجویز کے مجوز آپ ہی تھے۔

(ملاحظہ ہو علامہ اقبال کا بیان مطبوعہ سٹیٹسمین ۱۰ جون ۱۹۳۵ء)

۷- مولانا ظفر علی خاں اور جماعتِ احرار کی پیدا کردہ تحریک کے درمیانی دنوں میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے صدر شعبۂ معاشیات پروفیسر محمد الیاس برنی نے "قادیانی مذہب" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس کی لوح پر عبارتِ ذیل درج ہے:-

"دین و ملت کی صلاح و فلاح کا دعویٰ کر کے کس کس طرح تخریب و تفرقہ کی سازش کی گئی قادیانیت کا یہ فریب اسلام کی تاریخ میں یادگار رہے گا

اور انجام بھی عبرت آموز ہوگا ——————"

"قادیانی مذہب" کی اشاعت سے نہ صرف مرزائیوں میں ہلچل مچ گئی بلکہ پڑھے لکھے لوگوں میں اُن کی قلعی کھلنے لگی۔

۸۔ علامہ اقبال کی ہمنوائی میں لاہور ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج مرزا ظفر علی نے بھی بہ دلائل ثابت کیا کہ قومیں نبوتوں کی بنا پر الگ الگ شمار ہوتی ہیں۔

۹۔ مرزائیت کے کاسۂ سر پر سب سے کاری قانونی ضرب مسٹر جی۔ ڈی۔ کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کے فیصلے سے پڑی مرزائی بوکھلا گئے، اُنھوں نے بعض حصّوں کو محذوف کرانے کے لیے عدالت العالیہ سے رجوع بھی کیا، غرض یہ پہلا عدالتی جائزہ تھا، جس میں مرزائیوں کی "ریاست اندر ریاست" کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھایا گیا اور حکومت کو بھی غالباً پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ اس کا "خودکاشتہ پودا"[1] خودسر بھی ہے۔

[1] ملاحظہ ہو اعتراف مندرجہ "تبلیغ رسالت" جلد ہفتم بعنوان درخواست بحضور نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر، دام اقبالہ، منجانب مرزا غلام احمد مورخہ ۲۴ر فروری ۱۸۹۸ء

## قادیانیت کا مسلک

احرار کو اصرار تھا کہ:

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی کے بعد اگر کوئی شخص ظلی یا بروزی نبوت کا دعوٰی کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی وحدت کے موجودہ زوال سے فائدہ اٹھا کر اُن کی دینی وحدت کو بھی پارہ پارہ کرتا ہے جس کے نتائج دین و دنیا دونوں کے لیے خسران کا موجب ہونگے اور مرزائیت اسی خسران کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ مرزائی برٹش امپیریلزم کے کھلے ایجنٹ ہیں۔

۳۔ وہ عام مسلمانوں سے نہ صرف مذہبی علیحدگی رکھتے ہیں بلکہ پسماندہ مسلمانوں کا مجلسی اور معاشی

مغالطہ بھی کرتے ہیں جس کا واحد مقصد انہیں مرعوب و خوف زدہ کر کے اپنے حلقۂ بیعت
میں شامل کرنا ہوتا ہے۔

۴۔ وہ مسلمانوں میں بطور ففتھ کالم کام کرتے ہیں۔

(دیکھو تاریخ احرار صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۴)

## بیّن شہادت

احرار کے ان دعاوی اور بہ الفاظ مرزا محمود احمد "الزامات" کی پرکھ کے لیے ضروری ہے کہ ہم مرزائیوں اور ان کے محسنوں کی مستند تحریروں کی مستند تحریروں سے اصل حقیقت معلوم کریں اس سے مرزائیوں کو یہ شکایت نہ ہو گی کہ انہیں پرائی حکایت یا روایت پر ملزم گردانا گیا ہے، اور احرار کے دعاوی کی اصلیت بھی معلوم ہو جائے گی کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں، اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

جو لوگ پیغمبر یا رسول کہلاتے ہیں ان کے بارے میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ سب سے پہلے ان کا حسب و نسب دیکھا جاتا ہے جس سے عامۃ الناس جاننا چاہتے ہیں کہ مدعی خود کیا ہے؟ —— اسی اصل کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب سے پہلے مرزا صاحب کے خاندان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

مرزا صاحب "کتاب البریہ" کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

"میرے والد کو انگریزی حکام نے خوشنودی مزاج کی چٹھیاں دی تھیں۔
سر لیپل گریفن نے اپنی کتاب "تاریخ رئیسان پنجاب" میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔"

(ملاحظہ ہو: ریویو آف ریلیجنز صفحہ ۲۱۹ بابت جون جلد ۵ نمبر ۶)

اس تذکرہ کا اردو ترجمہ سید نوازش علی شاہ مترجم دفتر لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب نے ۱۹۱۱ء میں سرکار کی خصوصی اجازت سے کیا اور نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس کے زیر اہتمام بڑے تزک و احتشام

سے چھپوایا۔ اُس کی جلد دوم کے صفحہ ۶۶ پر مرزا غلام احمد صاحب کے خاندان کا شجرۂ نسب اور ضروری کوائف درج ہیں۔ انہی کے الفاظ میں اُس کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ عطا محمدؐ (مرزا صاحب کے دادا) اور اُن کا والد گل محمدؐ رام گڑھیہ اور کنھیا مسلون (سکھ جماعتوں) سے لڑتے رہے۔ آخر کار عطا محمدؐ اپنی تمام جاگیر کھو کر سردار فتح سنگھ اہلو والیا کی پناہ میں بیگووال چلا گیا، جہاں بارہ سال تک امن و امان سے زندگی بسر کی۔

۲۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عطا محمدؐ کی وفات پر اُس کے بیٹے غلام مرتضیٰ (مرزا غلام احمد کے والد) کو واپس بلا لیا، اور جدی جاگیر کا بہت بڑا حصہ واپس دے دیا۔ اِس پر غلام مرتضیٰ اپنے بھائیوں سمیت مہاراجہ کی فوج میں داخل ہوا اور کشمیر کی سرحد کے علاوہ دوسرے مقامات پر قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

۳۔ نونہال سنگھ، شیر سنگھ، اور دربار لاہور کے دور دورے میں غلام مرتضیٰ ہمیشہ فوجی خدمت پر مامور رہا۔ ۱۸۴۱ء میں جرنیل ونطورا کے ساتھ منڈی اور کلو کی طرف بھیجا گیا پھر ۱۸۴۳ء میں ایک پیادہ فوج کا کمیدان بنا کر پشاور روانہ کیا گیا۔ ہزارہ کے مفسدے میں اُس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

۴۔ جب پنجاب کا انگریزوں سے الحاق ہو گیا تو خاندان کے دوسرے افراد کی جاگیر ضبط ہو گئی لیکن سات سو روپیہ کی پنشن غلام مرتضیٰ اور اُس کے بھائیوں کو عطا کی گئی۔

۵۔ اس خاندان نے غدر ۱۸۵۷ء کے دوران میں بہت اچھی خدمات سرانجام دیں۔ غلام مرتضیٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کیے۔ اُس کا بیٹا غلام قادر (مرزا غلام احمد کا بھائی) اُس وقت جنرل نکلسن کی فوج میں تھا۔ اُس نے ۴۶ نیٹو انفنٹری (سیالکوٹ) کے باغیوں کو تہ تیغ کیا۔ جنرل مذکور نے غلام قادر کو ایک سند عطا کی جس میں درج تھا کہ اِن کا خاندان قادیان ضلع گورداسپور

کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا ہے۔

اپنی اس نمک حلالی کا اقرار و اعتراف خود مرزا صاحب اور اُن کے جانشینوں کو رہا۔ اُن کے اپنے الفاظ میں کتابوں کی ایسی پچاس الماریاں بھری پڑی تھیں جن میں انگریزوں کے قصیدے مرقوم تھے مگر سکھوں سے اپنی وفاداری کی پُوری رُوداد اسی طرح غائب کر دی جس طرح آج انگریزوں کے چلے جانے پر نیاز مندی کا ریکارڈ حذف کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور تعبیر و تاویل کا دلچسپ اثاثہ فراہم کر کے اس کا جواز پیدا کیا جا رہا ہے ـــــــــــــــــ

مرزا صاحب کے ان خاندانی حالات سے جن واقعات کی نشاندہی ہوتی ہے اُن کی تاریخی تفصیلات فراہم کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرزا صاحب کے اَب وجد نے مغلوں کی گرتی ہوئی دیوار کے زمانے میں سکھوں کا ساتھ دیا اور سکھوں کو زوال آمادہ پایا تو انگریزوں سے رشتۂ مودّت استوار کر لیا۔ مرزا صاحب کے دادا اور پڑدادا نے رام گڑھیا اور کھنیا مسلوں سے جو لڑائیاں لڑیں وہ کسی اسلامی مقصد یا اپنے اقتدار کے لیے نہ تھیں بلکہ ایک مسل کے خلاف دُوسری مسل کے حق میں تھیں کیوں کہ پنجاب کا بیشتر حصہ تاخت و تاراج ہو کر سکھوں کی بارہ مسلوں کے تصرّف میں تھا اُن میں سے چھ مسلیں دریائے ستلج کے جنوب میں اور چھ شمال میں تھیں مرزا صاحب کے بزرگ ان مسلوں کی باہمی جنگوں میں رام گڑھیا اور گھنیا مسلوں کے برخلاف اہلووالیا مسل کے حلیف تھے چنانچہ اہلووالیہ مسل کی شکست خوردگیوں کے باعث مرزا صاحب کے دادا کو قادیان چھوڑ کر سردار فتح سنگھ اہلووالیہ کی پناہ میں بگووال جانا پڑا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اکال گڑھ کی فتح یابی کے بعد اہلووالیہ مسل کے سردار فتح سنگھ کو رام کرنے کے لیے کپورتھلہ کا قصد کیا سردار مذکور کا باپ سردار بھاگ سنگھ وفات پا چکا تھا مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلے تو ماتم پرسی کی پھر پگڑی بدل کر اُس کو اپنا منہ بولا بھائی بنا لیا۔ اسی مفاہمت کے نتیجہ میں آگے چل کر مرزا عطا محمّد کے خاندان کی جلاوطنی ختم ہو گئی عطا محمّد

خود تو فوت ہو چکا تھا لیکن اُس کا بیٹا غلام مرتضیٰ مہاراجہ کی فوج میں ملازم ہو گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سردار فتح سنگھ اہلووالیہ نے متحد ہو کر ٹوسگہ فتح کیا پھر انہوں نے قصور پر چڑھائی کی اور خاں افتخار حسین خاں ممدوٹ کے مورثِ اعلیٰ نظام الدین خاں کو شکست دے کر قبضہ کر لیا۔ اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ——— مرزا غلام مرتضیٰ کی خدمات سے خوش ہو کر اُسے قادیان کی جاگیر کا ایک حصہ واگذار کر دیا۔

**خدماتِ جلیلہ**

غرض سر لیپل ایچ گریفن اور کرنل میسی کی روایت کے مطابق مرزا غلام مرتضیٰ نے اپنے بھائیوں سمیت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ہر تاخت میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں ان لڑائیوں کی تفصیلات کا یہ محل نہیں لیکن ظاہر ہے کہ کشمیر پشاور اور ہزارہ پر سکھوں نے جتنے حملے بھی کیے وہ بھی مسلمانوں کے خلاف تھے اِن حملوں میں مرزا غلام مرتضیٰ اور اُس کے بھائی ان ساونتوں اور سرداروں کے ہمراہ لڑتے رہے جن کے متعلق یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اُس دور میں اُن سے بڑھ کر مسلمانوں کے املاک و اموال اور عزت و آبرو کا کوئی دشمن نہ تھا اور جن کا واحد منصب العین مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا تھا ———

——— یہاں اس امر کا ذکر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ دربارِ لاہور نے اپنے دورِ دورے میں جن فوجی خدمات کو سر انجام دیا اُن میں ایک بڑا کارنامہ حضرت سید احمد بریلوی کی شہادت کا المیہ ہے اِس دربار کے جو سردار حضرت سید احمد بریلوی اور اُن کی جماعت مجاہدین سے مختلف معرکوں میں صف آرا ہوئے اُن میں جنرل ونتورا، ہری سنگھ نلوا اور مہاراجہ شیر سنگھ فرزند مہاراجہ رنجیت سنگھ پیش پیش تھے۔ مرزا صاحب کے والد اور بھائی انھی کی معیت میں لڑتے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کے والد اور چچا نے دربارِ لاہور کی حمایت میں کیا کارنامے سر انجام دیئے ہوں گے؟

حضرت سید احمد بریلوی کا سانحۂ شہادت اصل میں اعلائے کلمۂ رب العالمین اور احیائے سنتِ ختم المرسلین کا قتل تھا، جیسا کہ گریفن لکھتا ہے کہ مرزا صاحب کے والد ہمیشہ ہی فوجی خدمت پر مامور رہے تو ظاہر ہے کہ انھوں نے تحریک احیائے دین کے قتل میں سکھوں کے دوش بدوش حصہ لیا ہو گا عجب نہیں کہ وہ ہری سنگھ نلوہ کے ہمراہ بھی گئے ہوں، بہر حال سید صاحبؒ پر جو بیتی اُس کی المناک رُوداد مولانا غلام رسُول مہر کی قابلِ قدر تصنیف "سید احمد شہید" میں شرح و بسط سے درج ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ مرزا صاحب کے والد گریفن کی سوانحی نشاندہی کے مطابق شیر سنگھ کی قیادت میں سید احمد صاحبؒ سے ضرور لڑے ہوں گے، کیوں کہ اُن کی شہادت کے بعد ۱۸۴۳ء میں اُنھیں ایک پیادہ فوج کا کمانڈر بنا کر پشاور بھیجا گیا، جو بے شبہ کلّی اعتماد کے بغیر ناممکن تھا۔ اِن معرکوں کی سرگزشت تاریخِ پنجاب مصنفہ سید محمد لطیف میں بصراحت درج ہے۔ بعض زیرِ نظر مباحث کے پیش نظر قریبی اور یقینی شہادت اِسی تاریخ سے ماخوذ ہے چونکہ مرزا غلام مرتضیٰ نے اپنی فوجی خدمات کا بیشتر حصہ شیر سنگھ کی ماتحتی میں بسر کیا تھا اس لیے شیر سنگھ کے مختصر حالات نذرِ قارئین ہیں۔

### راجہ شیر سنگھ

شیر سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دُوسرا بیٹا تھا جو اپنی بھاوج مہارانی جنداں سے کش مکش کے بعد گدّی پر بیٹھ گیا۔ مہارانی جنداں کے حامیوں میں راجہ گلاب سنگھ، راجہ ہیرا سنگھ اور سندھا نوالیہ کے سردار تھے مہارانی جنداں اور مہاراجہ شیر سنگھ کی فوجوں کے مابین لاہور میں گھمسان کا رن پڑا۔ شیر سنگھ کے فوجیوں نے دہلی دروازہ اور یکی دروازہ سے لے کر قلعہ تک جو دکان یا مکان بھی نظر پڑا لُوٹ لیا۔ چھتہ بازار کو آگ لگا دی۔ حضوری باغ کے چاروں طرف سخت جھڑپیں ہوئیں شیر سنگھ کی سپاہ نے پاؤں اکھڑتے دیکھے تو ہزار بارہ سو کے قریب طوائفوں کو شہر سے پکڑ لائے اور توپوں کے دھانے پر رسیوں سے باندھ کر کھڑا کر

دیا تاکہ اس "فصیل" کے عقب میں اپنے آپ کو چھپالیں۔ شاہی مسجد کے چاروں میناروں پہ گولہ باری کے لیے توپیں رکھ دی گئیں تمام مسجد کو فوج کی رسدگاہ بنالیا گیا۔ اِدھر قلعہ کے محصورین نے فیصلہ کیا کہ مسجد کو بارود سے اڑا دیں لیکن اس ڈر سے مبادا آگ قلعہ کو بھی لپیٹ میں لے لے رُک گئے۔ اس محاصرہ میں لاہور کی نصف دوکانوں کو برباد ہونا پڑا۔ جس مکان میں شہتیریاں اور بلیاں نظر پڑیں اکھاڑ لی گئیں آخر جانبین میں صلح ہو گئی جو لوگ اس معرکے میں کام آئے ان کی لاشیں بے شمار زخمیوں کے ساتھ جلا دی گئیں۔ عام مجروحین نے واویلا کیا تو انھیں یہ کہ کر آگ کے الاؤ کی بھینٹ کر دیا گیا کہ موت سے کیوں ڈرتے ہو آخر مرنا ہی ہے ——————

یہی شیر سنگھ سندھانوالیہ کے ایک سردار اجیت سنگھ کی دغا کار بندوق کا نشانہ بنا اور اس کا سر ذرا ہی دھڑ سے جدا کر دیا گیا ——————

قدرت کا انتقام ملاحظہ ہو کہ جس شیر سنگھ کی کمانڈ میں حضرت سید شہیدؒ کا سر تن سے جدا کیا گیا تھا، وہی شیر سنگھ اپنے ہی ہاتھوں مارا گیا اس کا سر تن سے جدا کیا گیا، اور اب اس کی خاکستر تک اڑ چکی ہے لیکن بالاکوٹ کا مشہد آج بھی لاکھوں انسانوں کی جلوہ گاہِ ارادت ہے۔

**۱۸۵۷ء کا سانحہ** جنرل نکلسن نے ۴۶ نیٹو انفنٹری سیالکوٹ کے سپاہیوں کو جس بے دردی سے قتل کرایا وہ ایک لرزہ خیز داستان ہے۔ سر گریفن نے اُن کی قتل گاہ تریموگھاٹ بتائی ہے جو صحیح نہیں اُن سپاہیوں کو راوی کے کنارے قتل کیا گیا اور جو دیسی سپاہی اُن کے قتل پر مقرر کیے گئے وہ دن بھر ایک ایک باغی کو باری باری سے گولی کا نشانہ بناتے رہے اُن میں سے بیشتر اس ہوشربا نظارے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے۔ جنرل نکلسن کے مظالم اتنے بہیمانہ تھے کہ اکثر انگریز مورخوں اور وقائع نگاروں نے اُن کو انگریز قوم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ قرار دیا ہے۔ لارڈ الفنسٹن نے کہا تھا:

"ہماری فوجوں کے مظالم کا تذکرہ رُوح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے جہاں تک لُوٹ مار کا تعلق ہے ہم نادر شاہ ایرانی سے بھی بازی لے گئے ہیں"۔

اسی جنرل نکلسن نے مرزا غلام احمد صاحب کے والد ماجد کو سند عطا کی کہ قادیان ضلع گورداسپور کے خاندانوں میں ان کا خاندان سب سے زیادہ نمک حلال رہا ہے۔

جن دل خراش حوادث اور جانگداز وقائع سے ۱۸۵۷ء عبارت ہے اس سے پاکستانی اور ہندوستانی کماحقہٗ واقف ہیں۔ اب تو خیر انگریز جا چکے ہیں اور تاریخ کا گرد و غبار بھی بسرعت تمام دُھل رہا ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے لرزہ خیز حالات خود انگریزوں کے عہد میں سامنے آ گئے تھے اس بارے میں بربادی عامہ کی جزئیات تک محفوظ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کا خمیازہ تمام ہندوستانیوں کو بھگتنا پڑا اور مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو بھی لڑے تھے لیکن جو مصائب مسلمانوں پر ٹوٹے، اُس کے ماتم سے تاریخِ انسانی کبھی فارغ نہیں ہو سکتی اُن لاکھوں مسلمانوں کو جو بہمہ وجوہ نصاریٰ کی اطاعت کے خلاف تھے اور جن کے رگ و ریشہ میں راستباز عُلما نے اپنی مساعیٔ پیہم سے جوشِ جہاد بھر دیا تھا، ایک ایک کر کے ختم کیا گیا۔ لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس کام کا ایک مقصد تھا کہ:

"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خُدا کے حُکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان میں حکومت کریں گے"۔

چنانچہ لارنس نے باغیوں کی اس "عبرت ناک" سرکوبی پر اپنی والدہ کو ایک خط میں اظہارِ مسرت کرتے ہوئے لکھا:-

"ہم پشاور سے جہلم پیدل پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے چلے آئے۔ باغیوں سے اسلحہ چھینا اُن کو پھانسیوں پر لٹکایا اور توپ سے باندھ کر اُڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے

استعمال کیا اس سے لوگوں کے دل پر ہماری ہیبت بیٹھ گئی ہر چھاؤنی میں اسی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے۔"

ایک پادری کی بیوہ رقمطراز ہے:

"بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ موت کی کوئی خاص پروا نہیں کرتے تو بقیۃ السیف کو توپوں سے باندھ کر اڑایا گیا"۔

مرزا صاحب کے خاندانی ممدوح جنرل نکلسن نے مسٹر ایڈورڈ کو ایک خط میں لکھا:

"ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رُو سے ہم انگریز عورتوں اور بچّوں کے قاتلوں کو زندہ جلا سکیں، یا اُن کی کھالیں اتار لیں، یا گرم سلاخوں سے مدارات کریں پھانسی ایک معمولی سزا ہے"۔

سر ہنری کاٹن کی یاداشتوں میں درج ہے کہ:

"میں نے اپنے سکھ اردلی کی خواہش پر اُن بدبخت مسلمانوں کو عالمِ نزع میں دیکھا جنھیں مشکیں کس کے زمین پر برہنہ بدن لٹا دیا گیا اور اُن کے تمام جسم پر گرم تانبے کی سلاخیں داغ دی گئیں تھیں میں نے اُنھیں پستول سے ختم کر دینا ہی مناسب سمجھا — بدنصیب قیدیوں سے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی"۔

مسٹر ڈی لین ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا کا اقتباسِ ذیل رسل کی ڈائری کے صفحہ ۴۳ (مطبوعہ ۱۸۵۸ء) سے ماخوذ ہے:

"زندہ مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سینا یا پھانسی دینے سے پہلے اُن کے جسم پر سؤر کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا اور ہندوستان کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے

ساتھ بدفعلی کریں یقیناً عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہے "۔

—— نکلسن کا ان دنوں ایک ہی نعرہ تھا پھانسی پر لے چلو چنانچہ مجنیڈی لکھتا ہے کہ:

"وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی ہمارا زیادہ وقت اُن قیدیوں کو گولی مارنے یا پھانسی دینے میں گزرا ، جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا —— لیکن اُن کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار مترشح تھے جو کسی بڑے مقصد پر جان دینے کی علامتیں تھیں "۔

جنرل نیل ——

"فتح پور کے قصبے کو حراست میں لے کر تمام آبادی کو تہ تیغ کر دو اور سرغنوں کے سر عمارت پر لٹکا دو "۔

—— "ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کرتے تھے یعنی ملزم کو ہاتھی پر بیٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے اوپر سے رسی ڈال کر ہاتھی کو ہنکار دیا جاتا ملزم لٹک کر تڑپنے لگتا اور جانکنی کے وقت انگریزی کے ہندسے ۸ کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا "

—— عورتوں نے عصمت دری کے خوف سے خودکشیاں کرلیں ۔

—— مُردہ سپاہیوں کی لاشوں کو بھی درختوں پر لٹکا دیا گیا ۔

دہلی اور لکھنؤ کے شاہی خاندانوں پر جو بیتی وُہ ایک مستقل خونیں باب ہے دہلی کا حال تو یہ تھا کہ جس شخص کے چہرے پر داڑھی نظر آتی یا کسی کے پاجامہ کا پائنچہ اونچا معلوم ہوتا وہ تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا ۔

اور اس سارے خونین تماشے کا ہدایت کار کون تھا؟ بہ قول مسٹر ایڈورڈ ٹامسن "بیتہ قد

نکلسن" جس نے مرزا غلام احمد اور سردار سکندر حیات کے اسلاف کو نمک حلالی کی سندیں عطا کی تھیں یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ احرار نے اوّل الذکر کی "نبوت" کے خلاف دینی محاذ قائم کیا اور موخر الذکر کی سیادت کے خلاف سیاسی محاذ، لیکن دونوں کی بدولت بے شمار قوتوں کا ہدف غبار پڑا حتیٰ کہ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں ان کا گوشت پوست ہے پر لٹکا دیا گیا۔ غرض "غدر" کے حادثوں اور سانحوں پر W. H. FITCHEIT کی کتاب TALE OF THE GREAT MUTINY سے بہتر تبصرہ ناممکن ہے۔ وہ ایک پادری کی روایت سے لکھتا ہے:

"ایک دفعہ اُس نے عیسائی مبلغوں کی ایک جماعت سے کہا کہ وہ غدر پر جواب مضمون لکھیں لیکن ہر طالب علم نے بغیر کچھ لکھے کے خالی کاغذ واپس کر دیے جس کا مطلب خاموش متفقہ اور ناقابل عفو انکار تھا"[1]

**ٹیپو سے ظفر تک**

القصہ سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۷۹۹ء) سے جس المیہ کا آغاز ہوا تھا وہ ایک سو اٹھاون برس کی مدت میں بہادر شاہ ظفر کی جلا وطنی (۱۸۵۷ء) پر ایک نئے دور میں [داخل] ہو گیا ——

سلطان ٹیپو کی شہادت پر بہت سی تاریخیں کہی گئیں جن میں "شمشیر گم شد" تلوار گم ہوئی، الہامی ہے آخر ۱۸۵۷ء میں قطعِ یدبھی ہو گیا اب مسلمان سارے ہندوستان میں جسمانی طور پر مغلوب تھے اور صرف دماغوں کا قتل عمد باقی تھا اس خاکستر میں جو چنگاریاں بچ گئی تھیں اور جنھیں حضرت سید احمد شہیدؒ کے باقیات الصّلحات کہنا صحیح ہو گا اپنے ماضی کے پشتیبان تھے یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ سید احمدؒ کا جہاد صرف سکھوں ہی کے خلاف نہ تھا بلکہ اس کا اصل نشانہ انگریز تھے۔ گوالیار کے فرمانروا دولت راؤ سندھیا کے برادر نسبتی ہندو راؤ گھوٹکے کے نام سید احمد ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:-

---

[1] (غدر کے متعلق مندرجہ بالا حوالے "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" سے ماخوذ ہیں)

"وہ غیر جن کا وطن بہت دُور ہے، بادشاہ بن گئے، جو تاجر سامان بیچ رہے تھے اُنھوں نے سلطنت قائم کر لی —— "

اور اُن کے بارے میں اُن کا عزم کیا تھا، شاہ محمود درّانی والیٔ ہرات کے فرزند شہزادہ کامران کو لکھتے ہیں:

"پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوں گا، مرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے۔"

مومن خان مومن کے ایک نعتیہ قصیدے کے دُعائیہ اشعار سے بھی اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نزدیک جہاد کی علی التواتر تلقین و ترغیب کا مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج تھا۔ (ملاحظہ ہو جماعت مجاہدین مصنفہ غلام رسول مہر صفحہ ۱۱ تا ۱۶)

مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق حضرت سید احمد شہیدؒ کے جہاد کا رُخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرنے والے سر سید احمد خاں تھے۔

(دیکھو سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۵۲ عنوان افسانہ طرازیاں)

## جہاد سے خوف

انگریزوں نے ہندوستان تو فتح کر لیا تھا لیکن مُسلمانوں کے دل و دماغ میں جہاد کا جو عقیدہ راسخ تھا اُس کی عالمی رُوح سے انگریز غافل نہ تھے اور اُس کا تجربہ انھیں مُسلمان ملکوں میں خصُوصیت سے ہو رہا تھا بلکہ صلیبی جنگوں کا ایک پُورا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ لائیڈ جارج نے گو بہت بعد میں کہا لیکن انگریزوں کے تحت الشعور میں یہ خیال ہمیشہ جاگزین رہا کہ قرآن ہمارے راستے کی بہت بڑی روک ہے۔

اپنی اس کھُلی ہار (۱۸۵۷ء) کے بعد عُلما نے پینترا بدلا اور زور دینا شروع کیا کہ ہندوستان دارُالاسلام سے دارالحرب ہو گیا ہے۔ اس ذہنی صف بندی کی ایک گونہ تفصیلات ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی تصنیف "ہمارے ہندوستانی مُسلمان" سے معلوم ہوتی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں اُن علمائے کرام کے فتاویٰ بھی درج ہیں جو جسمانی امن کے بعد انگریزی حکومت کے پرستاروں اور گماشتوں کی معرفت حاصل

کیے گئے تھے مثلاً شمالی ہند کے: دو رام پوری اور سات لکھنوی علما کا فتویٰ جو سید امیر حسین شاہ اسسٹنٹ کمشنر بھاگل پور کے استفتا پر جاری کیا گیا اُس پر ۱۷/ جولائی ۱۸۷۰ء کی تاریخ ثبت ہے "ہندوستان میں جہاد جائز ہے یا نہیں؟" کا جواب دیتے ہوئے اُن علمائے کرام کا ارشاد ہے کہ:

"مسلمان رعایا کے پاس نہ اپنے حاکموں کے ساتھ لڑنے کی طاقت ہے نہ اُن کے پاس ہتھیار ہیں، برخلاف اِس کے اگر لڑائی شروع کر دی جائے تو شکست ناگزیر ہے جس سے اسلام کی عزت کو نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا جہاد واجب نہیں، ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے تو اُس میں مُسلمانوں کی فتح اور اسلام کی برتری کا قیاس غالب ہو اگر اس قسم کے قیاس کا امکان نہ ہو تو جہاد ناجائز ہے۔"

اسی کتاب میں ایک اور فتویٰ محمڈن سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے مرقوم ہے جس میں جہاد کو بغاوت سے تعبیر کیا گیا اور مُسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وُہ بغاوت کی صُورت میں اپنے حاکموں کا ساتھ دیں۔ یہ وُہ زمانہ تھا جب جماعتِ مجاہدین کا ذہن شمالی مغربی سرحدی علاقوں میں سرکش تھا اور انگریزوں نے ان پر لگاتار چڑھائیاں کر رکھی تھیں۔ چنانچہ اس جذبے کو مدھم کرنے کے لیے جمال دین ابن عبداللہ شیخ عمر حنفی مفتی مکہ معظمہ، احمد بن ذینی شافعی مفتی مکہ معظمہ اور حُسین بن ابراہیم مالکی مفتی مکہ معظمہ سے بھی فتوے حاصل کیے گئے جن میں ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کا اعلان کیا گیا تھا۔

## عُلما کے خلاف مقدمات

—— انگریزوں نے جنگ امبیلہ (سرحد ۱۸۶۳ء) کے بعد اُن مُجاہدین و معاونین پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیے جو ہندوستان کو دارالحرب کہتے اور جہاد و غزا کے علمبردار تھے ایک پٹھان غزن خاں کی مخبری پر تمام مددگار پکڑے گئے، جس سے مندرجہ تحت پانچ مقدمہ ہائے سازش کی بنا رکھی گئی۔

۱۔ مقدمۂ سازش انبالہ (۱۸۶۴ء) جس میں گیارہ ملزم تھے۔ مولانا یحییٰ علی صادق پوری ان کے امیر تھے جنھیں بقول راونشا "امیر المومنین" کا خطاب حاصل تھا مسٹر ہربرٹ نے انھیں سزائے موت سناتے ہوئے فیصلہ میں لکھا تھا:

"یہ شخص اسلام کے قابل نفرت اصولوں (جہاد) کی اشاعت کرتا رہا اور اپنی سازشوں سے برطانوی ہند کو ایک خطرناک سرحدی جنگ میں دھکیل دیا۔ اس کا تعلق ایک موروثی باغی جہادی خاندان سے ہے۔"

مولانا یحییٰ علی کی سزائے موت ایک عجیب دلیل کے ساتھ عمر قید بہ عبور دریائے شور میں بدل دی گئی۔ ڈپٹی کمشنر پھانسی گھر پہنچا اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی پانے کو بہت دوست رکھتے اور شہادت سمجھتے ہو لہٰذا سرکار تمہاری چاہیتی سزا تم کو نہیں دے گی تمہاری سزا، موت کے عمر قید میں بدل دی گئی ہے۔ مولانا کی داڑھی کے بال بجبر کتر دیئے گئے تو آپ کرتے ہوئے بالوں کو اٹھا اٹھا کر کہتے "افسوس نہ کر تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اس کے واسطے کتری گئی۔"[۱] (تواریخ عجیب صفحہ ۴۴)

ان کے علاوہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری اور میاں عبدالغفار کو بھی عمر قید کی سزائیں دی گئیں دونو نے ۲۸، ۲۸ برس جزیرہ انڈیمان میں بسر کیے قاضی میاں جان جیل ہی میں وفات پا گئے۔

۲۔ مقدمۂ سازش پٹنہ (۱۸۶۵ء) جس میں سید صاحب کے خلیفہ مولانا احمد اللہ صادق پوری کو موت کی سزا دی گئی جو عمر قید میں تبدیل ہو گئی لیکن کالے پانی ہی میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

۳۔ مقدمۂ سازش راج محل (۱۸۷۰ء) جس میں ابراہیم منڈل کو عمر قید بہ عبور دریائے شور کے علاوہ ضبطی جائیداد کی سزا دی گئی۔

۴۔ مقدمۂ سازش مالدہ (۱۸۷۰ء) جس میں مولوی امیرالدین ماخوذ تھے ان کے خلاف اقدام

---

[۱] (ان تفصیلات کے لیے دیکھو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک تالیف مسعود عالم ندوی صفحہ ۱۰۶ تا ۱۸۱)

تھا کہ روپیہ اور آدمی سرحد کو بھیجتے تھے عمر قید کی سزا پائی۔

۵۔ مقدمہ سازش پٹنہ (۱۸۷۱ء) اس میں سات ملزم تھے جج نے ایک کروڑپتی ملزم امیر خاں کی بابت لکھا کہ یہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق جہاد سے ثابت کیا جائے وہ فی الجملہ ضرور ہے جہادی نہیں لیکن امیر خاں سمیت پانچ ملزموں کو اس مقدمہ میں حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔

ان پانچ مقدمات سازش کے علاوہ ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۸۷۱ء تک بے شمار لوگ ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہے اُن کی تفصیلات زیرِ نظر کتاب کا حصہ نہیں لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان اپنی تمام وسعتوں کے باوجود مسلمانوں کے لیے خرابۂ حشر تھا۔

انگریزوں نے پنجاب فتح کرنے کے بعد سر توڑ کوشش کی کہ قبائلی علاقے کو مطیع و منقاد بنا لیں اور افغانستان پر قبضہ جمائیں اس غرض سے اُن کی پالیسی یہ تھی کہ جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کریں، لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ کرزن نے اس پالیسی ہی کو بدل ڈالا قبائلی خوانین کے وظیفے مقرر کیے افغان ملیشیا قائم کیا اور آخرکار پنجاب کے سرحدی اضلاع کو الگ کر کے ۱۹۰۱ء میں شمالی مغربی سرحدی صوبے کی بنا ڈالی۔

اس سے پہلے ۱۸۹۲ء میں سر مارٹیمر ڈیورنیڈ کی معرفت افغانستان اور ہندوستان کی جنوبی اور مشرقی سرحد طے پا چکی تھی جس کا نام ڈیورنڈ لائن رکھا گیا تھا۔

الغرض بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمانوں میں جہاد کا ذہن اتنا قوی تھا کہ انگریز اپنے لاؤ لشکر سمیت اس کی مزاحمت کرتے رہے انہیں یہ حسرت ہی رہی کہ مسلمانوں کو صحیح طور پر کچلا نہیں جا سکا جیسا کہ بعض سرکاری خطوط سے اس کا سراغ ملتا ہے مثلاً:

"پنجاب گورنمنٹ کو افسوس رہا کہ یہ مہم ختم ہو گئی لیکن ہندوستان کے مذہبی

مجنوں نکالے نہ جا سکے اور نہ ہم انھیں مطیع کر کے اُن کے گھروں میں واپس لا سکے۔"

(مسلمانانِ ہند ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۴۲)

یا پھر مسٹر ای سی بیلی سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے الفاظ ہیں:

"مسلمانوں کی مذہبی دیوانگی جس کے لیے قرآن سے کافی سند مل سکتی ہے۔
بہت بھڑکا دی گئی ہے ——— اندیشہ ہے کہ عامۃ المسلمین بہت جلد باغی
ہو جائیں گے جن میں ناراض مذہبی دیوانے اور تنگ نظر علما بھی شامل ہوں گے
جو حکومت سے جائز طور پر ناراض ہیں اور جاہل مسلمانوں پر بے حد اثر رکھتے ہیں"۔

(مسلمانان ہند ہنٹر صفحہ ۱۵۱)

ڈاکٹر ہنٹر نے مزید لکھا:-

"سب سے پہلے شمالی ہندوستان کے مسلمان علما نے حکومت کے خلاف جہاد کا فتویٰ
صادر کیا اس کے بعد مسلمانانِ بنگال نے اسی مضمون پر ایک رسالہ جاری کیا اور
شیعہ جو تعداد میں تھوڑے ہیں وہ بھی اپنے خیالات کی اشاعت سے رُک نہ سکے"۔

(مسلمانانِ ہند صفحہ ۱۸)

## علی گڈھ کی تحریک

دوسری طرف انگریزوں نے ہندوستان کے داخلی حصول میں علی گڈھ کی تحریک کو غنیمت سمجھا فروری ۱۸۷۳ء میں علی گڈھ کالج کی بنیاد رکھی گئی کالج کے بانی سر سید احمد خاں (علیہ الرحمۃ) پر پیش آمدہ حالات کی سنگینی کا ایک خاص اثر تھا اور وہ مسلمانوں کو اُن کی گرتی ہوئی دیوار سے بچانا چاہتے تھے چنانچہ تعلیمی، مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کا ایک سر چشمہ پھوٹنے لگا۔ جہاں تک قرآن مجید کی جدید تفسیروں اور اسلام سے عیسائیت کے اختلافات کی فروعی بحثوں کا تعلق تھا اُن کا فائدہ ارادی طور پر نہ سہی غیر ارادی طور پر انگریزوں

ہی کر پہنچا، کیوں کہ اصل مقصد مسلمانوں کے فکر و نظر میں سوچ بچار کی تبدیلیاں لانا اور اُن میں دو
ایسی جماعتیں تیار کرنا تھا جو نہ صرف باہم دگر شرعی اختلافات کا شکار ہوں بلکہ اُن کے الحاد سے
مسلمانوں کی مذہبی وحدت میں دراڑ واقع ہو چنانچہ اُن حصوں میں جہاں ۱۸۵۷ء کے حالات کا
بلاواسطہ اثر تھا۔ اور انگریزوں کے خلاف جذبات شدت پر تھے۔ ایک خاص کوشش سے اصولِ
مفاسد اور فروعِ مفاسد کی بنیادیں قائم کی گئیں ——— ابراہیم بن العذری عندیقی نے اِن
تین جملوں میں اِن مفاسد کی تعریف بیان کی ہے۔ تاویل الجاہلین و تحریف الغالین و انتحال المبطلین
——— سر ولیم میور یوپی کا گورنر تھا۔ اسی
نے علی گڑھ کالج کی پہلی عمارت ایم۔ اے۔ او سکول کا سنگِ بنیاد رکھا تھا اُس کو مسلمانوں سے اس
قدر عناد تھا کہ آج تک اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں سب سے
بدتر کتاب اسی بدبخت کی ہے اُس کی کتاب کا خلاصہ اُسی کے الفاظ میں یہ ہے کہ انسانیت کے دو
سب سے بڑے دشمن محمد کی تلوار اور محمد کا قرآن ہیں (نعوذ باللہ)

(دیکھو موجِ کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام صفحہ ۱۶۳)

——— جن لوگوں نے حوادث کے اس زمانے میں فسخ جہاد کی تاویلوں کے
علاوہ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ میں اُولی الامر کا مصداق
انگریزوں کو ٹھہرایا اُن میں مشہور انشاپرداز ڈپٹی نذیر احمد کا نام بھی ہے جو ایک شیوا بیان مقرر ہونے
کے علاوہ مایۂ ناز ادیب اور بلند پایہ مصنف بھی تھے انھوں نے قرآن مجید کے ترجمے میں انگریزوں
کو پہلی دفعہ اولو الامر قرار دیا اور اُن کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت سے مستلزم۔ اس
ترجمہ کی کاپی آپ نے سر ولیم مور کو انگلستان بھجوائی جس کی سفارش سے آپ کو "شمس العلما" کا خطاب
ملا۔ اسی ترجمہ پر آپ کو ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔ (دیکھو داستان تاریخ اردو مصنفہ حامد حسن قادری صفحہ ۴۹۸)

لیکن پنجاب میں "تاویل الجاہلین و تحریف الغالین و انتحال المبطلین" کے جمیع مظہر مرزا غلام احمد ثابت ہُوئے، جنھوں نے اپنے والد مرزا غلام مرتضیٰ کی وفات (۱۸۷۶ء) کے عرصہ بعد ۱۸۹۱ء میں مسیح اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا مرزا صاحب پہلے ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی عدالت میں ملازم تھے، وہاں سے مستعفی ہو گئے۔ انھوں نے تنسیخ جہاد کی تلقین و ترغیب سے بھی آگے قدم بڑھایا اور انگریزوں کی غلامی کا باقاعدہ جواز پیدا کرنے لگے۔ اس جواز کی بنیاد الہامات پر رکھی اور وہ تمام خصوصیتیں جو اسلامی اعتقادات کا طرۂ امتیاز تھیں، اپنی ذات میں مرتکز کرنا شروع کیں، اُن کے ان عجیب و غریب دعاوی اور افغانی علاقے میں جہاد و غزا کا زمانہ ساتھ ساتھ چلتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی سے اُدھر تک کا علاقہ تو دیوبند اور علی گڑھ کے ذہنی تصادمات میں مبتلا تھا، دہلی سے اِدھر پنجاب یعنی اٹک تک کے علاقہ میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ——— ظلّی اور بروزی نبوت !!

علما و مشائخ نے "جہاد" کے ساتھ "نبوت" کو ... لے، ابھی تو داخلی فتنے کی سرکوبی میں لگ گئے جس سے انگریزی حکومت کو فوری فائدہ یہ پہنچا کہ اسلام کا جو خطرہ اُسے درپیش تھا وہ مسلمانوں میں بٹ گیا ———

مرزا صاحب نے نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد بھی عیسائی مشنریوں سے مناظرے کیے، بعض ماڈرن لوگ اس کو مرزا صاحب کے حسنِ خدمات میں شمار کرتے اور غیر شعوری طور پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مرزا صاحب کی نبوت میں انگریزی حکومت کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی ہاتھ نہ تھا حالانکہ اس بارے میں ایک بات بالکل ہی صاف ہے کہ جو انگریز اس کوشش میں تھے کہ محمدؐ اور قرآن کو مسلمانوں کے سینے سے خارج کر دیں وہ کسی ایسے آدمی کو کیوں کر برداشت کر سکتے تھے جو نبوت کا مدعی ہو، اسلام کی تجدید چاہے اور احیائے دین کا داعی کہلائے پھر ایسے

صوبہ میں جو جماعتِ مجاہدین کی پناہ گاہوں کے دہانے پر واقع ہو۔ اور جس کے سرحدی صوبے میں لڑائیوں یا جھڑپوں کا غیر مختتم سلسلہ جاری تھا۔

مرزا صاحب نے عیسائی مشنریوں سے جو مجادلے کیے ملکہ وکٹوریہ کے نام ایک خط میں اُن کے متعلق رقمطراز ہیں کہ یہ مناظرے یا مجادلے صرف اس لیے کرتا ہوں تاکہ تنسیخ جہاد کے متعلق میں نے جو اُن تھک مساعی سرانجام دی ہیں اور برطانیہ کی وفاداری کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے مسلمانوں کو جس تسلسل سے رام کیا ہے اُس کے پیشِ نظر انھیں یہ شبہ نہ رہے کہ میں سرکار کی طرف سے اس کام پر مامور ہوں مشنریوں سے مناظرہ کرتا ہوں تو مسلمانوں میں تنسیخ جہاد کا اعتبار پیدا ہوتا ہے۔

## اپنی کہانی اپنی زبانی

اس طویل پس منظر کے بعد مرزائیت کی حقیقی غایت خود بخود اُبھر آتی ہے اب ذرا اس کی کہانی کسی دوسرے کی زبان سے نہیں بلکہ خود مسیح موعود اور مہدی معہود کی زبان الہام ترجمان سے سماعت فرمایئے:

۱۔ "ہمارا جاں نثار خاندان سرکار دولت مدار کا خود کاشتہ پودا ہے ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون بہانے اور جان دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا" (لیکن اللہ کی راہ میں جہاد حرام ہے، مؤلف)

(تلخیص از درخواست بحضور نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر منجانب خاکسار غلام احمد ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم مولفہ میر قاسم علی صاحب)

۲۔ "غرض یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکار انگریزی کی نمک پروردہ، نیک نامی حاصل کردہ اور مورد مراحم گورنمنٹ ہے"۔ (درخواست مذکورہ)

۳۔ مسیح موعود فرماتے ہیں میں مہدی معہود ہوں اور برطانوی حکومت میری تلوار۔ پھر ہم احمدیوں کو فتحِ بغداد سے کیوں خوشی نہ ہو عراق عرب ہو یا شام ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا

چاہتے ہیں۔"　　(اخبار الفضل جلد ۶، نمبر ۴۲ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۱۸ء)

۵۔ "بعض احمق سوال کیا کرتے ہیں کہ اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں سو یاد رہے کہ اُن کا سوال نہایت حماقت کا ہے کیوں کہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے اُس سے جہاد کیسا؟ میں سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی ایک بدکار اور حرامی آدمی کا کام ہے۔"　　(شہادت القرآن مصنفہ مرزا غلام احمد کا تتمہ منقول از "الفضل" جلد ۲۷ صفحہ ۲۰۹، ۱۲ ستمبر ۱۹۳۹ء)

۶۔ "ہمارے سر پر سلطنتِ برطانیہ کے بہت احسان ہیں وہ مسلمان سخت جاہل سخت نادان اور سخت نالائق ہے جو اس گورنمنٹ سے کینہ رکھے اگر ہم اس کا شکر ادا نہ کریں تو پھر خدا تعالیٰ کے بھی ناشکر گزار ہوں گے اُس سے زیادہ بے ایمان شخص کون ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا مسیح تو کہتا ہے کہ ہر مسلمان کو انگریزوں کی کامیابی کے لیے دُعا کرنی چاہئے اور یہ کہتا ہے کہ دُعا کی کیا ضرورت ہے انگریزوں کو شکست ہو تو زیادہ بہتر ہے۔"

("الفضل" مورخہ ۵ جون ۱۹۴۰ء) میاں محمود احمد کا خطبہ)

۷۔ "حضرت مسیح موعود نے اپنی پاک تعلیم میں گورنمنٹ عالیہ کی اطاعت اور وفاداری کو جزوِ مذہب قرار دے کر ہمیں ان منافق طبع مسلمانوں سے علٰحدہ کر دیا جو ابھی تک اس انتظار میں ہیں کہ خونی مہدی ایک جرار لشکر لے کر آبدار تلواروں اور سیاہ سرخ پرچموں کے ساتھ کہیں ظاہر ہوگا اور سب عیسائی سلطنتوں کو مٹا کر ان نام کے مسلمانوں کو حکمران بنا دے گا۔"

("الفضل" جلد ۴ نمبر ۸۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۱۷ء)

۸۔ "میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیوں کہ مجھ کو مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار ہے۔"

(اشتہار مرزا صاحب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم)

۹۔ "مَیں سولہ برس سے برابر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانانِ ہند پر اطاعت گورنمنٹ برطانیہ فرض ہے اور جہاد حرام ہے"۔

(اشتہار مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء مندرجہ "تبلیغ رسالت" جلد سوم صفحہ ۲۰۰)

۱۰۔ "مَیں نے ۲۲ برس سے اپنے ذمّے یہ فرض کر رکھا ہے کہ وہ تمام کتابیں جن میں جہاد کی مخالفت ہو اسلامی ملکوں میں ضرور بھیج دیا کروں گا"۔

(تبلیغ رسالت جلد دہم صفحہ ۲۶)

۱۱۔ "مَیں نے قرینِ مصلحت سمجھ کر مخالفتِ جہاد کو عام ملکوں میں پھیلانے کے لیے عربی اور فارسی کتابیں تالیف کیں، اور وُہ تمام کتابیں عرب، شام، روم، مصر، بغداد اور افغانستان میں شائع کی گئیں مَیں یقین کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی وقت اُن کا اثر ہوگا"۔

(غلام احمد از تبلیغ رسالت جلد ۔ صفحہ ۶۲)

۱۲۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نام تھے ایک محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو جلالی تھا دُوسرا احمد جو جمالی تھا، چونکہ فرقہ احمدیہ نام رکھنے میں اصل غرض اس امر کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ زمانہ جہاد اور خونریزی کا نہیں اس لیے احمدیہ نام اختیار کیا گیا"۔

(تلخیص از "سلسلہ احمدیہ کے مختصر حالات اور عقائد" از ریویو آف ریلیجنز)

بحوالہ افسر مردم شماری بمبئی صفحہ ۱۷۱ مئی ۱۹۰۶ء)

۱۳۔ "مجھے تین باتوں نے گورنمنٹ انگریزی کی خیرخواہی میں اوّل درجہ پر بنا دیا ہے:-

۱۔ والد مرحوم کے اثر نے

۲۔ اس گورنمنٹ عالیہ کے احسانوں نے

۳۔ خدا تعالیٰ کے الہام نے"۔ (تریاق القلوب صفحہ ۳۰۹، ۳۱۰)

۱۴۔ میرے پانچ اصول ہیں جن میں دو حرمتِ جہاد اور اطاعت برطانیہ بھی ہیں۔

(تلخیص از تبلیغ رسالت صفحہ ۱۰۷)

۱۵۔ "یہ عاجز گورنمنٹ کے اُس قدیم خاندان میں سے ہے جس کی خیرخواہی کا گورنمنٹ کے عالی مرتبہ حکام نے اعتراف کیا اور اپنی چٹھیوں سے گواہی دی ہے ــــ مسلمانوں کا فرض ہے کہ گورنمنٹ محسنہ کے ناشکرگزار نہ بنیں ورنہ نمک حرامی سے خدا کے گنہگار نہ ٹھہریں کیوں کہ یہ گورنمنٹ ہمارے مال و خون کی محافظ ہے"۔

۱۶۔ "مجھے عیسائی رسالہ "نور افشاں" میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف توہین آمیز الفاظ پڑھکر اندیشہ ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں پر جو ایک جوش رکھنے والی قوم ہے ان کلمات کا کوئی سخت اشتعال دینے والا اثر پیدا نہ ہو تب میں نے ان جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی صحیح اور پاک نیت سے مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کو دبانے کے لیے حکمت عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے تاکہ سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں بدامنی پیدا نہ ہو ــــ میرے کانشنس نے مجھے فتویٰ دیا کہ اسلام میں جو بہت سے وحشیانہ جوش والے آدمی موجود ہیں ان کے غیظ و غضب کی آگ بجھانے کے لیے یہ طریق کافی ہوگا" ــــ

ــــ "مجھ سے پادریوں کے مقابل پر جو کچھ وقوع میں آیا یہی ہے کہ حکمتِ عملی سے بعض وحشی مسلمانوں کو خوش کیا گیا۔"

(عریضہ خاکسار بحضور گورنمنٹ عالیہ مرزا غلام احمد از قادیان المرقوم ۲۷ دسمبر ۱۸۹۹ء مندرجہ تریاق القلوب صفحہ ۳۰۶)

۱۷۔ مرزا صاحب کے خاندان کی وفاداری کا اعتراف سرکارِ عالی مدار کے علاوہ جناب چیف کمشنر صاحب بہادر پنجاب نے اپنے ایک خط مجریہ ۱۰ اگست ۱۸۵۸ء (بحوالہ ۵۷۶) میں کیا اور دوسرا روپیہ صلہ خدمت دیا گیا، دوسرا خط مرزا غلام قادر (برادر مرزا غلام احمد) کے

نام سر رابرٹ ایجرٹن فنانشل کمشنر نے لکھا ہے تیسرا خط جناب ولسن صاحب کمشنر بہادر لاہور کا ہے جو مرزا غلام مرتضیٰ کو لکھا گیا ان سب خطوں میں خاندان کی وفاداری کا اقرار ہے۔

—— ان خطوط کا حوالہ دینے کے بعد مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

"تمام فرقوں میں ہمارا فرقہ ہی گورنمنٹ کا وفادار اور جان نثار ہے سرکار تجربہ کے وقت ہمارے آدمیوں کو اوّل درجہ کا خیر خواہ پائے گی۔"

"ہمارے خاندان نے سرکار کی راہ میں خون بہانے اور جان دینے سے کبھی فرق نہیں کیا۔"

(خاکسار مرزا غلام احمد ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء ماخوذ از تبلیغِ رسالت جلد ہفتم)

۱۸۔ "سلسلہ احمدیہ کا گورنمنٹ برطانیہ سے جو تعلق ہے وہ باقی تمام جماعتوں سے نرالا ہے ہمارے فوائد ایک ہو گئے ہیں اگر خدانخواستہ اس کو کوئی نقصان پہنچا تو اس صدمہ سے ہم بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔" (تبلیغِ قادیان کا اعلان مندرجہ "الفضل" ۲۷ جولائی ۱۹۱۸ء)

مندرجہ بالا اقتباسات مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ مرزا صاحب کو وفاداری کی جن پچاس الماریوں پر ناز ہے اُن کی بعض عبارتیں اتنی خطرناک اور شرمناک ہیں کہ ؎

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

مرزا صاحب کی ایک ایسی ہی درخواست بحضور گورنر جنرل بہادر کشورِ ہند مجریہ یکم جنوری ۱۸۹۷ء از تبلیغ رسالت میں درج ہے جس میں آپ نے اپنے وفادارانہ خیالات کا اعادہ کرنے کے ساتھ اُن لوگوں کا ایک خانہ دار نقشہ دیا ہے، جو حکومت کے غیر وفادار ہیں اور نماز جمعہ صرف اس لیے نہیں پڑھتے کہ یہاں کوئی خلیفہ موجود نہیں ہندوستان اُن کے نزدیک دار الحرب ہے اور یہ سرکار عالیہ کی منشا کے خلاف ہے۔

ان ارشادات کی تائید و تکمیل کے لیے مرزا صاحب کا طرزِ مخاطبت یہ ہے کہ:

۱۔ ہم رسول اور نبی ہیں۔ (اخبار بدر ۵ مارچ ۱۸۹۸ء)

۲- سچا خدا وہی ہے جس نے قادیاں میں اپنا رسول بھیجا۔ (دافع البلاء صفحہ ۱۱)

۳- خدا نے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ میں اُس کی طرف سے ہوں مجھے اِس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر وہ ہزار نبیوں پر بھی تقسیم کیے جائیں تو ان کی بھی اُن سے نبوت ثابت ہو سکتی ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۳۱۷)

۴- جو وحی و نبوت کا جام ہر نبی کو ملا وہ مجھے بھی ملا ہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۹۹)

——— اور جو اُن کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے ان کے حق میں ارشاد ہوتا ہے:-

۱- کُل مسلمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کی ہے مگر کنجریوں اور بدکار عورتوں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۵۴۷)

۲- جو شخص میرا مخالف ہے وہ عیسائی، یہودی، مشرک اور جہنمی ہے۔

(تبلیغِ رسالت جلد ۹ صفحہ ۲۷)

۳- جو شخص ہماری فتح کا قائل نہیں ہوگا تو صاف سمجھا جائے گا کہ اُس کو ولد الحرام بننے کا شوق ہے حرامزادوں کی یہی نشانی ہے۔ (انوار الاسلام صفحہ ۳۰)

۴- ہمارے دشمن بیابانوں کے خنزیر ہوگئے اور ان کی عورتیں کتیوں سے بھی بڑھ گئیں۔

(دُرِّ ثمین عربی صفحہ ۲۴۹)

۵- کُل مسلمان جو حضرت مسیحِ موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوتے خواہ انھوں نے حضرت مسیحِ موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر ہیں۔ (آئینہ صداقت ۳۵)

## عام مسلمانوں سے سلوک

۱- حضرت مسیحِ موعود نے سختی سے تاکید فرمائی ہے کہ کسی احمدی کو غیر احمدی کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ جتنی دفعہ بھی پوچھو گے اتنی دفعہ ہی میں یہی جواب دوں گا کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنی جائز نہیں، جائز نہیں، جائز نہیں۔ (انوارِ خلافت صفحہ ۸۹ از مرزا محمود احمد)

۲- ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیوں کہ

ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں۔ (انوارِ خلافت ۹۰)

۳۔ اگر کسی غیر احمدی کا چھوٹا بچہ مرجائے تو اس کا جنازہ کیوں نہ پڑھا جائے وہ تو مسیح موعود کا منکر نہیں؟ میں یہ سوال کرنے والے سے پوچھتا ہوں کہ اگر یہ بات درست ہے تو پھر ہندوؤں اور عیسائیوں کے بچوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا جاتا ہے۔ (انوارِ خلافت ۹۳)

۴۔ حضرت مسیح موعود نے اس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے، جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے آپ سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو آپ کی وفات کے بعد اس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفہ اوّل نے اس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اُس کی توبہ قبول نہ کی، باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔ (انوارِ خلافت ۹۳-۹۴)

۵۔ حضرت مسیح موعود نے غیر احمدیوں کے ساتھ صرف وہی سلوک جائز رکھا ہے جو نبی کریم نے عیسائیوں کے ساتھ غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ کی گئیں ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا، ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا، اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ جو ہم اُن کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں، دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں دینی اور دُنیوی دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے اور دُنیوی تعلق کا بھاری ذریعہ رشتہ و ناطہ ہے سو یہ دونو ہمارے لیے حرام قرار دیے گئے اگر کہو کہ ہم کو اُن کی لڑکیاں لینے کی اجازت ہے تو میں کہتا ہوں کہ نصاریٰ کی لڑکیاں لینے کی بھی اجازت ہے اور اگر یہ کہو کہ غیر احمدیوں کو سلام کیوں کہا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ بعض اوقات نبی کریم نے یہود تک کو سلام کا جواب دیا ہے۔

("کلمۃ الفصل" مندرجہ ریویو آف ریلیجنز صفحہ ۶۹)

یہ خیالات انیسویں صدی کی آخری دہائی میں، ۱۸۵۷ء کے خون اور خوف کی وجہ سے

سر لیے گئے اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں علما کے تبلیغی محاسبہ تک محدود رہے لیکن ہندوستان کی کاملاً بیداری اور مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد ان کا احتساب ناگزیر ہو گیا۔ اگر مسلمانوں نے مزاحمت شروع کی اور اس مزاحمت کے فرائض احرار نے اپنی طبعی افتاد کے باعث اپنے ذمے لے لیے تو یہ اُن سیاسی اور دینی حالات کا قدرتی نتیجہ تھا جن دینی و سیاسی حالات کے مظہر احرار تھے۔ احرار اگر مزاحمت نہ کرتے تو ایک سانحہ ہوتا۔ احرار نے مزاحمت کر کے ایک ایسی جماعت کو زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا جس کا وجود علامہ اقبال کے الفاظ میں نہ صرف مسلمانوں کی دینی وحدت کے لیے خطرے کا موجب تھا بلکہ اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتا تھا گویا یہودیت کی طرف راجع ہے اور جس کا وظیفہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کے حق میں الہامی بنیادیں فراہم کرنا تھا۔

فسادات پنجاب (۱۹۵۳ء) کی تحقیقاتی عدالت نے اس "قضیۂ نامرضیہ" کو عجیب و غریب حالات میں چھیڑا اور عجیب و غریب نتائج سے سمیٹا۔ جن اطلاعات پر عدالتی رپورٹ لکھی گئی، ان کے مطالعہ سے دو باتیں صاف طور پر مترشح ہوتی ہیں۔

اوّلاً جماعتوں میں احرار سب سے زیادہ گردن زدنی قرار دیے گئے ہیں۔

ثانیاً افراد میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری خفیہ پولیس کے قلم کی غیر ثقہ زد میں ہیں۔

ان حالات میں اس رپورٹ کے مندرجات کا تجزیاتی مطالعہ زیرِ نظر مباحث میں زیادہ مفید ثابت ہوگا کیوں کہ ایک تو اس رپورٹ کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی سی ہو گئی ہے۔ دوسرے اس کے بغیر شاہ جی کی سوانحی تصویر کے بعض خطوط ادھورے نہیں تو مدھم ضرور رہ جاتے ہیں تیسرے اصل مسئلہ کی وضاحتی راہیں سامنے آجاتی ہیں۔

---

# مرزائیت

## پاکستان کے بعد!

احرار کے نزدیک لیگ کا موقف ہندوستانی مسلمانوں کے قومی مسئلے کا سیاسی حل نہ تھا لیکن وہ اس کی مخالفت مذہب کے واسطے سے کرتے تھے۔ اس کے برعکس قادیانی قیام پاکستان کو اپنے مذہب کی موت سمجھتے تھے لیکن سیاستہً گومگو کی حالت میں تھے۔ مرزا محمود احمد کی بعض تحریروں سے پاکستان کی مخالفت کا نمایاں سُراغ ملتا ہے اور منیر انکوائری رپورٹ نے بھی اُس کی نشان دہی کی ہے (رپورٹ انگریزی ۱۹۶) لیکن احرار چونکہ مسلمان عوام سے مخاطب تھے اور اُن کا نقطۂ نگاہ مشروط طور پر کانگرس کا نقطۂ نگاہ تھا، اس لیے اُن کی مخالفت کا چرچا ہو گیا۔ اور مرزا محمود احمد کی مخالفت کا چرچا یا شہرت اس لیے نہ ہو سکی کہ وُہ نہ تو لیگ کے مقابلے میں صف آرا تھے اور نہ اُن کا رویہ مزاحمانہ تھا۔ بلکہ وُہ جس خلافت کو قائم کیے ہُوئے تھے اس کی بقا یا استحکام کے لیے قیام پاکستان سے خائف تھے۔ انھیں جائز طور پر یہ اندیشہ تھا کہ پاکستان میں "خود کاشتہ پودا" پروان نہیں چڑھے گا اور تحقیقاتی رپورٹ کے الفاظ میں اعتزال و تفریق

کی حوصلہ افزائی نہیں ہو گی۔

چنانچہ احرار کے لیے انگریزوں کا نکل جانا سالہا سال کی جد و جہد کا خوش آیند نتیجہ تھا اور قادیانیوں کے لیے انگریزوں کا نکالا جانا ناخوشگوار سانحہ ——— لیکن دونوں کو اپنے افکار و کوائف کے باعث ایک ایسی منفی صورتِ حالات کا سامنا کرنا پڑا جس کا صحیح آئینہ فسادات پنجاب (۱۹۵۳ء) کی عدالتی رپورٹ ہے۔

آنریبل جسٹس محمد منیر اور آنریبل جسٹس محمد رستم کیانی اس رپورٹ کے مُرتبین ہیں ہز ایکسیلینسی گورنر پنجاب کے آرڈی ننس نمبر ۳ (۱۹۵۳ء) کی ہدایات و شروط کے مطابق یہ تحقیقاتی کمیٹی قائم کی گئی۔ فاضل جج صاحبان کی تجویز کی ہُوئی بعض ترمیموں کے بعد فسادات پنجاب تحقیقات عامہ (۱۹۵۴ء) ایکٹ بن گیا اور یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقات کا آغاز ہوا۔ کُل ۱۱۷ اجلاس منعقد کیے گئے جن میں ۹۲ اجلاس شہادتوں کے لیے مخصوص رہے۔ ۲۸ فروری ۱۹۵۴ء کو کمیشن نے اپنا کام ختم کر دیا۔ فاضل ججوں نے ۳۸۰ صفحات پر مشتمل انگریزی میں ایک رپورٹ لکھی جس کا اردو ترجمہ سرکاری اہتمام میں کرایا گیا، جو محکمۂ تعلقاتِ عامہ (پنجاب) نے شائع کیا اور اس کے ۴۲۵ صفحات ہیں ———

جتنی جماعتیں اس معرکے میں ماخوذ تھیں ان میں سے لیگ اور احرار کے سوا تقریباً سب نے اپنے جوابی تبصرے کتابی شکل میں شائع کیے۔ لیگ نے اس سارے قضیے کو خواجہ ناظم الدین اور میاں محمد ممتاز دولتانہ کی ذمہ داری پر محمول کیا جو وزارتوں سے سبکدوشی کے بعد لیگ کی مرکزی اور صُوبائی صدارتوں سے بھی علٰحدہ ہو چکے تھے۔

احرار کی جوابی راہ میں تین رُکاوٹیں تھیں:

اولاً، وُہ ایک خلافِ قانون جماعت قرار دے دیے گئے تھے۔

ثانیاً وہ ہمیشہ سے قلم کے بجائے زبان کے ساونت ہیں۔

ثالثاً، رپورٹ میں جس طرح ان کا ذکر کیا گیا اس کے پیش نظر وہ صفائی کی نعمت اپنے سر لینے کو تیار نہ تھے۔

بہرحال ساری رپورٹ غور طلب مندرجات کی حامل ہے۔ جہاں تک فاضل مرتبین کی محنت شاقہ اور فراستِ فائقہ کا تعلق ہے۔ اس کا ہر کوئی مداح ہے۔ فاضل عدالت نے پیش آمدہ صورتِ حالات کا تجزیہ مہیا کردہ شہادت کو سامنے رکھ کر کیا اور نتائج مرتب کرنے میں جس قابلیت کا ثبوت بہم پہنچایا، اسے ایک ایسا شخص ہی نظر انداز کر سکتا ہے۔ جس نے حقائق سے آنکھیں موند لی ہوں اور سمجھتا ہو کہ آنکھوں پر پٹی باندھ لینے سے حقائق ٹل سکتے ہیں

تمام خرابی ان واقعات کی بوقلمونی میں ہے جنھیں رپورٹ میں زیر بحث لایا گیا، مولانا مرتضیٰ احمد نے اس بوقلمونی ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے "محاسبہ" (جوابی تبصرہ) کا سرآغاز اس طرح کیا ہے کہ:

"رپورٹ کی مثال اس ہاتھی کی ہے جس کے مختلف اعضا کو چھ اندھوں نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولا اور اپنی حسِ لامسہ کی مدد سے ہاتھی کے متعلق ہر ایک نے اپنا جُداجُدا مخصوص تصور قائم کر لیا۔ ایک نے کہا، ہاتھی ایسا تھا جیسے عمارت کا ستون۔ دُوسرا بولا، ایک بہت بڑا چھاج۔ تیسرے نے کہا، موٹا سا اژدھا۔ چوتھے نے کہا کہ ہاتھ بھر کی موٹی رسّی۔ پانچویں نے کہا ناہموار سا چبوترہ۔ چھٹے نے ارشاد فرمایا وُہ تو ایک دیوار سی تھی اور بس! اس رپورٹ نے بعینہٖ اسی قسم کی کیفیت عامۃ النّاس میں پیدا کی ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق اس کے متعلق اپنا خیال اور تصور قائم کر چکا ہے یا کر رہا ہے۔"

مزید برآں اس خرابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تحقیقات کا دائرہ غیر ضروری حد تک پھیلتا چلا گیا۔ خود حکومت کا اس بارے میں کوئی نقطۂ نگاہ نہ تھا۔ محولہ اختیارات کی دفعہ ۵ کی ذیلی دفعہ ۵ میں بصراحت درج تھا کہ عدالت مجموعہ ضابطۂ فوجداری کی شرائط و قیود کی پابند نہ ہوگی۔ بنا بریں عدالت نے قانون شہادت کی پابندی سے مختلف راستہ اختیار کیا چنانچہ رپورٹ کی ابتدا میں اس کا اشارہ موجود ہے ـــــــ

## خفی اور جلی پہلو

بہر حال رپورٹ کے بہت سے خفی اور جلی پہلو ہیں :-

۱۔ اس رپورٹ کو علما کے برخلاف ایک اجتماعی مقدمہ (collective Trial) کی خصوصیت حاصل ہے۔ ساری اسلامی تاریخ میں اس نوعیت کا کوئی مقدمہ نہیں۔ میاں فضل حسین نے ۱۹۳۶ء کے اواخر میں احرار سے قادیانی محاذ چھیننا چاہا تو مولانا ظفر علی خاں کو ڈلہوزی بلا کر ترغیب دی کہ وُہ عدالت عالیہ میں مقدمہ دائر کر کے قادیانی جماعت کے نامسلمان ہونے کا فیصلہ حاصل کریں۔ مولانا مقدمہ دائر کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن اس تجویز کی اطلاع میاں صاحب مرحُوم کے ایک معتقد نے راتوں رات چوہدری افضل حق کو پہنچا دی۔ جس صبح "زمیندار" میں اس تجویز کا اعلان کیا گیا۔ اُسی صبح چودھری صاحب نے اپنے اخبار "مجاہد" میں بھانڈا پھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔

گو اُس مقدمہ کی تجویز اور اِس مقدمہ کی نوعیت میں دَر و دیوار کا اختلاف ہے لیکن بُنیاد کی رُوح میں چنداں اختلاف نہیں صرف احوال و ظروف کا فرق ہے۔ ایک گروہ جو مُلا کی رجعت خواہی سے بیزار ہے۔ اس اجتماعی مقدمہ کو علما کی شکست فاش سمجھ کر خوش ہے۔ دُوسرا گروہ جس میں ماخوذ افراد یا جماعت کے متعلقین شریک ہیں اپنے معتُوبین یا ملزمین کی رُسوائی پر خوش ہے۔ تیسرا گروہ فسادات کے اسباب و علل کی کنہ تک پہنچنے کو

تو درست سمجھتا ہے لیکن بعض علمی، عملی، شرعی اور نظری مباحث کے لیے عدالت کی عاجلانہ فضا کو ناموزوں خیال کرتا ہے ——— چوتھا گروہ ان عناصر پر مشتمل ہے جن کے جذبات کا خلاصہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مشرقی پاکستان کے حالات کی تجزیاتی رپورٹ میں بالفاظ ذیل پیش کیا ہے :

"اسلام کے خلاف وسیع پراپگنڈے کی پُشت پر ہندو اور کمیونسٹ دماغ ہیں جو اسلام کو ناکام مذہب ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اُس کی ساری تاریخ کو گھناؤنی اور قابلِ نفرت شکل میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اس کے نظامِ زندگی کو ناکارہ اور نقصان رساں اور فرسودہ وجاہلانہ نظریات کا مجموعہ بتاتے رہے ہیں اور اس کام میں ان کو سب سے زیادہ مدد مُنیر رپورٹ سے ملی ہے جس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس وقت دُنیا میں کوئی ایسی دُوسری دستاویز موجود نہیں ہے جو مشرق و مغرب میں اسلام اور مُسلمانوں کے خلاف اس قدر غلط فہمیاں پھیلانے کی موجب ثابت ہُوئی ہو۔" (صفحہ ۱۷، ۱۸)

۲۔ تمام رپورٹ میں ضروری شہادت کا مدار زیادہ تر سی آئی ڈی کی رپورٹوں پر ہے جن کے مطالعہ سے کسی کو کوئی بالواسطہ فائدہ پہنچا ہے تو وُہ سیاسی کارکنوں کو، جو پہلی دفعہ یہ جاننے لگے ہیں کہ سی آئی ڈی کی یادداشتیں کس طرح ڈھلتی ہیں۔ اس کے دماغ کس طرح سوچتے ہیں۔ اُن کے علم و فکر کی معراج کیا ہے اور جو مسوّدے اُن کے ہاں تیار ہوتے ہیں اُن کا رنگ و روغن کیسا ہوتا ہے پھر ان لوگوں کا ذکر وُہ کس لب و لہجہ سے کرتے ہیں جن سے انھیں اختلاف ہو لیکن وہ عامۃ الناس میں مقبول و ممدوح ہوں القصہ ان رپورٹوں نے

عام سپاہیین کر چوکنا کر دیا اور خلوتیان راز کر کما حقہٗ پتہ چل گیا کہ سی آئی ڈی کا اشہب قلم اختیارات کی مہمیز لگتے ہی کہاں کہاں فراٹے بھرتا ہے۔

**احرار کے خلاف محاذ**

۲۔ تمام رپورٹ کے بالاستیعاب مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ:

(الف) سی آئی ڈی نے احرار کو شروع دن ہی سے ہدفِ مطاعن بنائے رکھا۔ اس نے اصل نزاع کو سمجھنے کی بجائے صرف احرار کو ملزم گردانے کی کوشش کی۔ اس کا طریقِ فکر ایک ایسے ناولسٹ کے اندازِ تحریر پر رہا جو ایک خاص قسم کی ذہنی فضا تخلیق کر کے اچھے بُرے کردار پیدا کرتا اور اپنے زورِ بیان سے نکھارتا چلا جاتا ہے۔ احرار کے باب میں سی آئی ڈی کا قلم زیادہ تر جراح کے بجائے قصاب کا چھرا نظر آتا ہے۔ اس نے فوٹوگرافی کے بجائے مصوری کے فرائض اپنے اوپر تھوپ لیے اور جس طرح چاہا ویسی تصویر بنا کر بزعمِ خویش اپنے قلم کی داد حاصل کی ہے ـــــــــــ

(ب) اس نے بظاہر قانون و انتظام کے مسئلے کو سامنے رکھا لیکن جو کچھ لکھا۔ اس پر سیاست و انتقام کا رنگ غالب رہا۔ قادیانیت کی پوری تاریخ کو نظر انداز کر دیا اور غالباً سی آئی ڈی کے دانشوروں کو اس کا شعور ہی نہ تھا، لیکن ماضیِ مرحوم میں احرار کی سیاسی شکستوں کے پیشِ نظر جو ثقہ و غیر ثقہ روایت مل گئی اس کو اس مفروضہ پر جوڑ توڑ لیا کہ تحریکِ پاکستان میں احرار اور لیگ کی کھلی ہوئی مخالفت کا اجتماعی ذہن اس کی توثیق و تسلیم کے لیے کافی ہو گا

(ج) ایک چیز جو ان رپورٹوں میں شروع سے آخر تک موجود ہے وہ اربابِ انتظام بالخصوص پولیس کے افسرانِ مجاز کا بغیر عنوان رویّہ ہے کہ وہ نصف صدی سے زائد

کی اس کش مکش کو بار بار "احمدی احرار نزاع" کا نام دیتے ہیں۔

نظر بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قادیانی حکومت کے مختلف صیغوں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور افسرانِ مجاز ان کے شعوری یا غیر شعوری احترام یا خوف میں محصور تھے دوسری طرف احرار مقابلۃً ایک شکست کھائی ہوئی جماعت تھے۔ جن کے لیے لیگ کا سیاست خانہ اپنی ہی فراہم کی ہوئی نارسائیوں کے باعث اجنبی تھا۔ بیوروکریسی کی عادت مستمرہ ہے کہ وہ کسی مسئلے اور اس کی نوعیت کو نہیں دیکھتی بلکہ جو لوگ پیش کر رہے ہوں ان کے اجزائے نسب اور اعضائے خیال کی جانچ میں منفی ذہن سے کام کرتی ہے پھر عوام یا حکومت کے خزانۂ عامرہ سے لاکھوں روپیہ بطورِ تنخواہ وصول کرنے کے بعد جو شاہکار تصنیف کرتی ہے' اس کے نادر نمونے سی آئی ڈی کی زیر بحث یادداشتوں میں بکثرت موجود ہیں۔

**نادر نمونے** ان یادداشتوں میں افسرانِ مجاز شروع سے آخر تک اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ :

—— احرار احمدیوں کے خلاف دشنام طرازی کی مسلسل مہم چلا رہے ہیں۔ (صفحہ ۱۵ محررہ ۳۱ اگست ۱۹۵۰ء)

—— احرار مقرروں نے مرزا غلام احمد کو ماسٹر تارا سنگھ سے تشبیہ دی اور چودھری ظفر اللہ خان کے خلاف توہین آمیز اشارات کیے انھیں مسلمان قوم کا غدار بتایا، جماعتِ احمدیہ کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش باتیں کیں۔ (صفحہ ۱۷)

—— مجلس احرار احمدیت کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش اور غلیظ باتیں تو کرتی ہے اب اس نے دانستہ بھی اور نادانستہ بھی تشدد کی حمایت شروع کر

دی ہے ——

—— احرار برصغیر کی تقسیم کے خلاف تھے۔ اُن پر کانگرس اعتبار کرتی تھی اور وہ ہمیشہ کانگرس کے کارکنوں سے خلا ملا رکھتے تھے۔ (صفحہ ۱۹ محررہ ۱۹ جون ۱۹۵۰ء)

—— احرار نے اپنی پوری توجہ احمدیوں کی بدگوئی پر مرتکز کر دی اور نہایت شرمناک دُشنام طرازی کا آغاز کر دیا —— مرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات ناگوار حد تک نقل کیے جاتے ہے اور اُن کو توڑ مروڑ کر اُن سے فحش اور غلیظ مطالب نکالے جاتے ہیں۔

—— مرزا غلام احمد اور موجُودہ خلیفہ کو زناکار اور خلافِ وضعِ فطرت حرکات کا مُرتکب ظاہر کیا جا رہا ہے۔ (صفحہ ۲۰)

احراری شائستگی کے حدُود سے تجاوز کر چکے اور احمدیوں کے خلاف بے باک حملے کرتے رہے ہیں۔ (صفحہ ۳۴ یادداشت محررہ یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء)

—— بُخاری ہرگز باز نہ آئے گا کیونکہ اس کا اِس کے سوا اور کوئی وصف ہی نہیں کہ وُہ احمدیوں کو گالیاں دیتا ہے۔ ضدی اور ہٹیلا آدمی ہے (صفحہ ۳۸ محررہ ۱۴ نومبر ۱۹۵۱ء)

احرار احمدی نزاع روز بروز بڑھتا جاتا ہے (صفحہ ۳۸ یکم دسمبر ۱۹۵۱ء)

—— اس میں شک نہیں کہ احراری لیڈر اور کارکُن ہماری مملکت کی سلامتی اور اس کے امن و امان کو تباہ کرنے پر تُلے ہُوئے ہیں اور احمدیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کا ظاہری مقصد تو احمدیوں اُن کے خلیفہ اور سر ظفر اللہ خان کو بدنام کرنا ہے لیکن ان کا اندرُونی مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بدنظمی اور لاقانونی پیدا کریں۔ (صفحہ ۴۲ محررہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۱ء)

—— احرار بجائے خود ایک مسئلہ ہیں۔ (لیکن قادیانی؟ مؤلف)

(صفحہ ۵۰، محررہ ۵ اپریل ۱۹۵۲ء)

—— (قادیانی) اگر دوسرے اسلامی فرقوں کے افراد کو اپنے رسوم میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتے یا غیر احمدی مسلمانوں کے ساتھ نماز یا دوسرے دینی وظائف میں شریک ہونے سے پورا اجتناب کرتے ہیں تو یہ خالصتہً اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔

(صفحہ ۵ محررہ ۳۰ مئی ۱۹۵۲ء)

—— بدقسمتی سے (لفظ بدقسمتی پر غور فرمائیے۔ مؤلف) عام مسلمانوں کا ذہنی رجحان احمدیوں کے خلاف ہے۔ (صفحہ ۵۲، محررہ ۳۰ مئی ۱۹۵۲ء)

—— آج کل جماعتِ احرار کا کام صرف یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف زہریلا پراپگنڈا کیا جائے۔ (صفحہ ۵۶)

—— احرار عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے اب تین نعرے استعمال کر رہے ہیں:-

۱۔ مسئلہ ختم نبوت کی تبلیغ واشاعت

۲۔ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا اعلان

۳۔ چودھری ظفر اللہ خان کی موقوفی

جہاں تک نمبر ۱ کا تعلق ہے۔ مرکزی حکومت واضح طور پر بتائے کہ ہمیں کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس مطالبے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ جسے احرار اور بعض دوسرے مسلمان ردِ مرزائیت کہتے ہیں۔ کیا ہمیں ان سرگرمیوں کی اجازت دینی چاہیے یا ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جن کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے باشندوں کی ایک قلیل سی

جماعت کو جسمانی یا مذہبی اعتبار سے نابود کر دیا جائے۔ احمدیوں کی جماعت مسلّمہ عقائد پر قائم ہے اور غیر احمدیوں کے عقائد زنگار زنگ ہیں اگر آخر الذکر کو احمدیوں کے خلاف جوش و خروش کے اظہار کی اجازت دی جائے تو کیا احمدیوں کو بھی یہ حق دیا جائے گا کہ وہ منبر اور پلیٹ فارم سے صرف اپنے عقائد کو صحیح اور دوسرے تمام عقائد کو کفر قرار دیں اگر ہم یہ حق جمہور کے کسی ایک طبقے کو دے دیں تو کیا ہم عیسائیوں کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار ہوں گے کہ وہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق اپنے خیالات کی اشاعت کریں؟ (حضورؐ کی ختم المرسلینی اور غلام احمد کی ظلّی نبوّت کو ایک دوسرے سے ریکٹ کرنا انتظامیہ ہی کے فکرِ رسا کی بوالعجبی ہو سکتی ہے —— راقم) اور آیا ہم شیعوں کو بعض نامور ترین صحابہ کرامؓ کے متعلق اپنے جذبات کے عام مظاہرے کا موقع دینے پر آمادہ ہوں گے؟ کیا مقصود یہ ہے کہ اس مُلک کو متخاصم گروہوں اور مذہبوں کا میدانِ جنگ بنا دیا جائے تاکہ جو لوگ شکست کھا جائیں وُہ تباہ ہو جائیں یا مذہب بدلنے پر مجبور کر دیے جائیں جس اژدہا کو احرار منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں۔ اس کو اس کے خروج سے پہلے ہی ہلاک کر دینا چاہیے ورنہ وُہ ہماری آزادی اور ہمارے تمام مالوفات و محبوبات کو نگل جائے گا۔

(صفحہ ۷، محررہ ۴ جولائی ۱۹۵۲ء)

—— ارکان مرکز کو اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ احرار جو آخری دم تک پاکستان کے قیام کی مخالفت کرتے رہے ہیں اب پاکستان کو ختم کرنے کے لیے جو دباؤ ڈالنا شروع کیا ہے آیا وُہ اس سے مغلوب ہو جائیں گے۔ مرکز کو جو کچھ بھی فیصلہ ہو اس سے حتی الامکان جلد از جلد ہر شخص کو مطلع کر دینا چاہیے۔ (یادداشت مذکورہ صفحہ ۳)

—— منٹگمری کا ایک رُسوائے عام احراری (زبان ملاحظہ ہو —— مرتب)

کا رکن جو حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا چچیرا بھائی ہے۔

—— سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کے متعلق جو کچھ کہا بہتر یہی ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے اس کا ذکر قابل اعتراض ہے۔ (صفحہ ۱۲۱)

—— محمد علی جالندھری ایک بد آہنگ سیاسی مقرر ہے۔

(صفحہ ۱۲۲، محررہ ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء)

—— سید عطاء اللہ شاہ بخاری کبھی باز نہیں رہ سکتے۔ ان کے ذہن میں گالی کے سوا اور کچھ نہیں۔ (صفحہ ۲۳۱)

—— احرار مقررین کو چودھری ظفر اللہ خان اور بانی جماعت احمدیہ کے خلاف علی الاعلان توہین آمیز باتیں کہنے سے روکا جائے۔ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں مرزا غلام احمد کو دجال کذاب اور زانی اور چودھری ظفر اللہ خان کو غدار اور دشمن پاکستان کہتے ہیں (صفحہ ۲۵)

—— احراریوں کی اس شورش کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں اور احمدیوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۶)

ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی نے اپنی یادداشتوں میں کئی دفعہ اس بات پر اظہار خفگی کیا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کا ذکر قابل اعتراض طریق سے کرتے ہیں مگر یادداشتوں میں اس سیاق و سباق کا ذکر قطعاً مفقود ہے جس کے تحت ملکہ وکٹوریہ کا ذکر کیا جاتا رہا لیکن ڈپٹی انسپکٹر جنرل کو بہرحال اصرار رہا کہ ملکہ معظمہ کی توہین کی جاتی ہے چنانچہ

۲۸ اکتوبر ۱۹۵۲ء کی ایک یادداشت میں ڈی آئی جی مرزا غلام احمد کے ایک رؤیا:

حضرت فاطمہؓ[1] نے کشفی حالت میں اپنی ران پر میرا سر رکھا ...... (ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۸)

---

[1] سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں قیامت کے دن عرش سے منادی ندا کرے گا کہ اے اہل محشر اپنے سروں کو نیچے جھکا دو اور اپنی آنکھیں بند کر لو، فاطمہ بنت محمدؐ پل صراط سے گزر جائے۔ اس وقت ستر ہزار حوریں حضرت سیدۃ النساء کے ہمراہ بجلی کی طرح پل صراط سے گزر جائیں گی

کی توضیح کا فریضہ اپنے ذمے لیتے ہوئے فرماتے ہیں :

"ظاہر ہے کہ اس میں مرزا صاحب نے دُخترِ رسولؐ کا ذکر بالکل اس طرح کیا تھا جیسے کوئی ماں کا ذکر کرے"۔

لطف یا ستم کی بات یہ ہے کہ افسرانِ مجاز کو مرزا غلام احمد، میاں محمود احمد اور چودھری ظفر اللہ خان وغیرہ کے بارے میں احرار کے لب و لہجہ پر سخت اعتراض ہے لیکن اپنی یادداشتوں میں جو بلیغ الفاظ وُہ احرار بالخصوص سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق استعمال کرتے ہیں اور اس میں ٹکسالی زبان کے جو نوادر پائے جاتے ہیں۔ غالباً افسرانِ مجاز نے ان کے بارے میں کبھی غور ہی نہیں کیا ——— ؟

تمھاری زُلف میں آئی تو حُسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

## جماعتِ اسلامی کی رائے

ایسے ہی لولوئے لالا کی چمک دمک پر جماعتِ اسلامی کے تبصرہ نگاروں جناب نعیم صدیقی اور جناب سعید احمد ملک نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنی جوابی تصریحات میں لکھا ہے کہ

"وُہ محرکات جو قادیانیوں کے خلاف تحریک میں حصّہ لینے کے لیے مختلف جماعتوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، اُن کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیوروکریسی کی پست ذہنیت کا ایک معمولی سا نمونہ ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اس مفروضہ پر اپنے خیالات اور احکام کی بنا رکھتے ہیں کہ جو شخص یا گروہ بھی سرکارِ عالی کی منشا کے خلاف کچھ کہتا ہے وہ بدنیتی اور گھٹیا درجے کے خود غرضانہ محرکات ہی کی بنا پر کہتا ہے۔ ایمان دارانہ رائے صرف سرکاری دفتروں کے

کُرسی نشینوں کا اجارہ ہے، جو لوگ اپنی خدمات کے صلے میں بڑے بڑے عُہدوں پر ترقیاں پاتے ہوں وُہ تو ہیں کمال درجہ نیک نیّت اور جنھیں اپنے مشن کی راہ میں قدم قدم پر جان و مال کے نقصانات سے سابقہ پیش آتا ہے وُہ سب کچھ خود غرضی اور بدنیّتی کی بنا پر کرتے ہیں"

(تبصرہ، صفحہ ۱۱، ناشر مکتبۂ جماعتِ اسلامی، لاہور)

۴۔ تمام رپورٹ میں دلچسپ تضادات اور غلط اطلاعات کے نمونے عام ہیں احرار کے سوا تقریباً سبھی جماعتوں نے ان کی نشان دہی کر دی ہے ——————

**مشقِ ستم**

چونکہ احرار تحریکِ پاکستان میں عدم شرکت کی وجہ سے بہر حال تختۂ مشقِ ستم تھے۔ اِس لیے اُن کے متعلق گفتنی و ناگفتنی سبھی باتیں جمع ہوتی رہی ہیں۔

سی آئی ڈی کا اصُول ہے (پاکستان بن جانے کے بعد بھی) کہ وُہ اپنے مخبر کا اتا پتا اپنی اطلاعات سے بھی زیادہ صیغۂ راز میں رکھتی ہے لیکن اس رپورٹ سے دونوں بھرم کھُل گئے۔ اوّلاً مندرجہ معلومات کی سطح اتنی پست ہے کہ مخبروں کی قابلیت یا عداوت کا چہرہ نما سامنے آجاتا ہے۔ ثانیاً ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی محترم ماسٹر تاج الدین صاحب صدر احرار سے بھی اپنی "معلومات" کے حصُول کا اقرار کرتے ہیں: اس امر کا انکشاف انھوں نے عدالت میں ماسٹر جی کے رُوبرُو کیا۔ فاضل جج صاحبان کی رائے ہیں:

"اگر ماسٹر تاج الدین اپنی جماعت ہی کی جاسوسی کر رہے تھے تو وُہ اور بات ہے ورنہ ہمیں تو یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی دی ہُوئی اطلاع پر ذریعۂ اطلاع ظاہر کیے بغیر اس قدر اعتبار کیا جائے کہ اس کو

رپورٹ میں درج کر لیا جائے ——— ہم نے اس معاملہ کے متعلق جو کچھ فائلوں سے نقل کیا، اُن کو مسٹر انور علی کے بیان کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس سے یہ رائے قائم کرنے کے لیے خاصا مواد مُہیّا ہو جاتا ہے کہ ماسٹر تاج الدین[1] مسٹر انور علی کو سیدھے راستے سے منحرف کرنے میں کامیاب ہو گئے"

## واضح غلطیاں

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل چند معلوماتی غلطیوں ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سی آئی ڈی کی اطلاعات کا ابتدائی سسٹم ناقص تھا؟ یا محض احرار ہی کے بارے میں غلط بیانیوں سے کام لیا جاتا رہا ہے؟

(ا) رپورٹ کے تیرھویں صفحہ کی چوتھی سطر میں جماعت احرار کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

"اس کے دو لیڈروں یعنی مولوی عبد الغنی ڈار اور مولانا حبیب الرحمٰن نے بھارت میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا"

جن لوگوں کو پنجاب مرحوم کے رجال سیاست سے تھوڑی سی شناسائی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولوی عبد الغنی ڈار کبھی احرار کے جماعتی دوست نہ تھے بلکہ مولانا حبیب الرحمٰن کے برخلاف لدھیانہ کانگرس کی رُوح و رواں تھے اُنھیں احرار راہنماؤں سے ہمیشہ ہی شخصی اور جماعتی اختلاف رہا۔ جن عناصر نے احرار کو کانگرس سے دُور کرنے یا دُور رکھنے میں بیش از بیش حصّہ لیا، اُن میں مولوی عبد الغنی ڈار بھی ایک تھے۔

(ب) ارشاد ہوتا ہے (صفحہ ۳۷) جو تنبیہ ایک دفعہ صدر مجلس احرار ماسٹر تاج الدین

---

[1] چودھری افضل حق مرحوم نے تاریخ احرار (صفحہ ۱۳۰، ۱۳۵) میں ماسٹر جی کو خراج ذیل ادا کیا ہے:۔
"ماسٹر تاج الدین ہماری جماعت میں بڑے جوڑ توڑ کے آدمی ہیں ...... میں نے انھیں کام کے لحاظ سے عملی جیونٹی اور تدبر کے اعتبار سے دشمن کو تاروں میں الجھا کر مارنے والی مکڑی پایا ہے"

انصاری کو اور پھر مولوی مظہر علی اظہر جنرل سیکرٹری کر دی گئی تھی، اس کا کوئی اثر نہیں ہوا

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اگر تمام رپورٹوں کا معاملہ اسی طرح ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہی علیم و خبیر ہے کہ کیا ہوگا"

(رپورٹ کا اختتامیہ)

مولانا مظہر علی اظہر قیام پاکستان سے ڈیڑھ برس پہلے مجلس احرار کو چھوڑ چکے اور لیگ سے باہر قیام پاکستان کے حق میں تھے۔ انھوں نے پاکستان بن جانے کے بعد مرزائیت کی تحریک میں نام کو بھی حصہ نہیں لیا اور نہ دوبارہ مجلس احرار کا رُخ ہی کیا۔ خدا معلوم انہیں کہاں اور کیونکر تنبیہ ہوگئی۔ خود اُن کے علم میں اس لطیفہ کے سرزد ہونے کا دن یا تاریخ نہیں ہے

(ج) احراری لیڈر تقسیم کے فوراً بعد "آئی این اے" کے (جنرل) شاہنواز سے سازباز میں مصروف تھے جو بعد میں بھارت چلا گیا۔ (صفحہ ۵۰)

اس الزام کی حقیقت سے نقاب سرکانا مناسب نہیں لیکن خدا نیتوں کے بھید جانتا ہے۔ پھر اس کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ شاہ نواز نے سازباز کی یا خدمت؟ بہرحال اب تو بہت سے پاکستانی بھی اس کی شہادت دینے کو تیار ہوں گے ......؛

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

(د) مولانا محمد علی جالندھری کا بیان ہے کہ وہ ملتان میں صوبائی گورنمنٹ کے حکم سے پابند تھے۔ ایک روز اُنھیں ڈپٹی کمشنر نے طلب کیا اور کہا کہ فلاں ضلع میں آپ نے جو تقریر کی ہے وہ حکومت کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ جب اُس سے کہا گیا کہ میں تو آپ کے حکم سے یہاں پابند ہوں، میری تقریر وہاں کیونکر ہوگئی تو وہ خود فرضی رپورٹ پر ششدر رہ گیا

(ی) جن اخباروں کی مندرجہ روئدادوں کو احرار کے خلاف شہادت کی دستاویز بنایا گیا، اُن میں سے ننانوے فی صد کی بہتان آرائیوں اور قلم فروشیوں کا رخ رپورٹ ہی کے مندرجات سے معلوم ہو جاتا ہے۔

۵۔ فاضل عدالت نے جو رویّہ اختیار کیا اور اپنے تجربے کی بُنیادیں جس اصل پر قائم کیں وُہ تمام تر فریقین کی مُہیّا کردہ تھیں۔ ایک سوال میں بہت سے سوال مدغم ہوتے گئے۔ اگر مسئلہ محض مسئلہ کی حیثیت سے سامنے آتا تو یقینی تھا کہ تجربے کی صُورت مختلف ہوتی لیکن تحقیقات کا دائرہ پھیلتا گیا اور ملزموں کی فہرست بڑھتی گئی۔ مولانا مُرتضیٰ احمد میکش نے محاسبہ میں ایسے تمام "ملزموں" کی فہرست دی ہے جو فاضل جج صاحبان کے ریمارکس کا تختۂ مشق بنے لیکن صفائی میں اپنے حسبِ منشا گواہ یا وکیل پیش نہ کر سکے، اُن کے نام یہ ہیں:

۱۔ مُسلم و مومن کی تعریف

۲۔ مسئلۂ قتلِ مُرتد

۳۔ مسئلۂ جہاد

۴۔ مسئلۂ مالِ غنیمت و خمس

۵۔ جمہوریت

۶۔ نمائندہ حکومت اور نفاذِ قانون و استحفاظِ آئین

۷۔ لہو و لعب اور اسلام

۸۔ آرٹ اور اسلام

۹۔ اسلامی ریاست

۱۰۔ بین الاقوامی قوانین و مجالس اور اسلام

۱۱۔ احادیث و سُنن

۱۲۔ کنونیشن کے مطالبات

۶۔ احرار کی دستارِ جماعت میں اس قسم کے موتی ٹانک دیے گئے کہ:

(الف) اُنھوں نے احمدیوں کے خلاف نہایت پست قسم کی دُشنام طرازی اور مسخرگی سے کام لیا۔ ان کی پالیسی کا غالب اور بنیادی اصُول یہ ہے کہ وُہ کسی کے ماتحت ہو کر کام نہیں کریں گے۔ اسی اصول کے ماتحت وُہ کانگرس سے علیحدہ ہوئے گو اس کے بعد بھی اُنھوں نے کانگرس سے ملنے جلنے اور اس کے آگے دم ہلانے کا رویّہ جاری رکھا

(ب) اُنھوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کا مسلسل استعمال کیا۔ اُنھوں نے کانگرس کو ترک کیا تو مذہبی وجوہ کی بنا پر، مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت کی، تو وُہ بھی مذہب ہی کی بنا پر۔

(ج) ان کی نیّتوں کو مسٹر قربان علی خان انسپکٹر جنرل پولیس سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا۔ (اللہ اکبر)

(د) ان کے متعلق ہم نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا طرزِ عمل بطورِ خاص مکروہ اور قابلِ نفرین تھا ——— کوئی احمق ہی ان کے دعویٰ مذہبیت سے دھوکا کھا سکتا ہے ——— خواجہ ناظم الدّین نے ان کو دُشمن پاکستان قرار دیا اور وہ اپنی گزشتہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسی لقب کے مستحق تھے۔

(ہ) جو پارٹی پاکستان مسلم لیگ اور اس کے تمام لیڈروں کی مخالف اور کانگرس کی محض ایک کنیز تھی۔ اس کے لیے کیونکر ممکن تھا کہ وُہ اپنے گزشتہ نظریات کو ترک کر دیتی۔ (صفحہ ۲۷۳ تا ۲۷۸)

—— اور یہ ردِّ عمل احرار کے ماضی و حال کا منطقی نتیجہ تھا۔

(ا) احرار اپنا مقدمہ کماحقہٗ پیش کرنے سے قاصر رہے تھے۔

(ب) ان کے ایڈووکیٹ قائدِ اعظم کی بارے میں خود ایک مسئلہ بن گئے تھے۔

(ج) چونکہ حکومت کا سارا نزلہ احرار پر گر رہا تھا۔ اس لیے مارشل لا ایسے سانحات کی مسئولیت سے بچنے کے لیے ہر فرد اور ہر جماعت نے مشترکہ ڈیفنس سے گریز کیا۔

(د) تمام سماعت میں مسئلہ نزاع اور فساد اکھٹے کر لیے گئے۔ جس سے مسئلہ دب گیا۔ نزاع کو زیرِ بحث لایا گیا اور فساد کے برگ و بار کو ملحوظ رکھتے ہوئے رپورٹ کی بنیادیں استوار ہوتی گئیں۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی نے تو تعریضاً احراری ہونا بدقسمتی سے تعبیر کیا ہے لیکن حقیقۃً احراری اپنی تمام تر صلاحیتوں اور عظیم قربانیوں کے باوجود بدقسمت تھے ان کی مثال قسمت حرمن ذوم کی سی ہے کہ جاں نثاری کے باوجود ہر معرکہ میں ہار ان کا نوشتۂ تقدیر رہی ہے۔

—— تحریکِ خلافت میں احرار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مُلک کے طول و عرض کو گرما دیا لیکن کھویا سب کچھ، پایا کچھ بھی نہیں بہ قولِ اقبالؒ ع

چو مہ از گردشِ خود کاستم من

—— کانگرس کے دوش بدوش غیر مُلکی حکومت سے لڑتے رہے۔ بارہا اس سے آگے نکلنے کی کوشش بھی کی مگر ——

سحر ہوئی تو گل و لالہ کا نشاں نہ رہا

—— تحریکِ کشمیر کی نیو اٹھائی اور حاصل ؟

ابر کی برق باریاں نہ گئیں

**تین حادثے**

غرض احرار کے لیے تین حادثے سخت ہی جاں گسل ثابت ہوئے۔ پہلی بار

شہید گنج کے جھگڑے میں آ گئے اور خواص کے ہاتھوں پٹنا پڑا۔ دوسری دفعہ تحریکِ پاکستان میں عوام کی شدید ناراضی نے سیاسی طور پر گور کنارے پہنچا دیا۔ تیسری بار قادیانیوں کے مقابلے میں اربابِ اختیار کے قہر و غضب کا شکار ہو گئے۔ اوّلاً شہرت کھوئی، ثانیاً قیادت ثالثاً جماعت ——— گویا

تھی اس خیال پہ بنیاد آشیانے کی
کہ بجلیوں کو تمنّا ہے مسکرانے کی

بہر کیف فاضل جج صاحبان نے رپورٹ میں تسلیم کیا ہے کہ

## احمدیوں سے مسلمانوں کے اختلافات

۱۔ عامۃ المسلمین سے احمدیوں کے اختلافات کی عمر نصف صدی سے بھی زیادہ ہے

۲۔ (ملک کی) تقسیم سے پہلے وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے پراپگنڈے اور تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ قیامِ پاکستان سے صورتِ حالات بدل گئی اب اگر احمدی یہ سمجھتے تھے کہ ——— (نقطۂ نگاہ یا نقطۂ کار کی تبدیلی کے بغیر بھی عوام میں) ان کی سرگرمیوں کے خلاف کوئی برہمی پیدا نہ ہو گی اور نئی مملکت میں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا تو گویا وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔

اُن کی سرگرمیوں اور جارحانہ نشر و اشاعت میں بدلے ہوئے حالات کے باوجود کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ غیر احمدی مسلمانوں کے خلاف دل آزار باتیں برابر کہی جاتی رہیں مرزا محمود احمد کی کوئٹہ کی تقریر نہ صرف نامناسب بلکہ غیر مآل اندیشانہ اور اشتعال انگیز تھی اس تقریر میں انھوں نے بلوچستان کے صوبے کی پوری آبادی کو احمدی بنا لینے اور صوبے کو مزید جد و جہد کے مرکز کی حیثیت سے استعمال کرنے کی علی الاعلان حمایت کی۔ اسی طرح

جب انھوں نے اپنے پیروؤں کو یہ ہدایت کی کہ تبلیغِ احمدیت کے پراپاگنڈے کو تیز کریں تاکہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک پوری مسلم آبادی احمدیت کے آغوش میں آجائے تو گویا مسلمانوں کو تبدیلیٔ مذہب کے متعلق سرگرمیوں کا کھلا نوٹس دے دیا ـــــــــ

احمدی افسروں نے لوگوں کو احمدی بنانے کی مہم میں از سر تا پا مصروف ہو جانا اپنا فریضہ خیال کیا ـــــــ

(تلخیصات از صفحہ ۲۷۹ تا ۲۸۰، اُردو ترجمہ)

۴۔ قادیانی اپنی مطبوعات میں مسلمانوں کی مقدس مصطلحات مثلاً امیر المؤمنین، اُمّ المومنین، سیّدۃُ النّسا اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں اُن کے استعمال پر فاضل جج تحریر فرماتے ہیں :

"ہمارا وظیفہ یہ نہیں کہ ہم اس امر کا فیصلہ کریں کہ آیا یہ نام صحیح طور پر استعمال کیے گئے یا نہیں لیکن ان اصطلاحات کے استعمال سے مسلمانوں کے احساسات پر جو اثر ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہمیں ذرّہ بھر شک نہیں کہ یہ اصطلاحات اپنے مخصوص اور محدود استعمال کی وجہ سے مُقدّس بن چکی ہیں اور تاریخ اسلام کی بعض اعلیٰ ہستیوں کی یاد سے مختص ہو چکی ہیں۔ احمدیوں کے لٹریچر میں حضرت رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خاندان (اہلِ بیت) کی بعض خواتین کے متعلّق جو ذکر ہُوا ہے۔ اس کے بارے میں بھی ہماری رائے یہی ہے۔ اگرچہ اس شکایت کی ایک مثال غالباً زیادہ بیہودہ صُورت میں قلائد الجواہر میں بھی موجود ہے بلاشبہ حضرت رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور کسی دُوسرے زندہ یا مُردہ شخص کے درمیان کسی قسم کا

موازنہ ہر مومن کے لیے دل آزاری کا موجب ہے۔

(رپورٹ انگریزی صفحہ ۱۹۰)

۵۔ جب تقسیم ملکی کے ذریعے سے مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ وطن کے امکانات اُفق پر نمودار ہونے لگے تو آنے والے واقعات کا سایہ احمدیوں کو فکر مند بنانے لگا۔ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے آغاز تک احمدیوں کی بعض تحریرات منکشف کرتی ہیں کہ وہ برطانیہ کا جانشین بننے کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن جب پاکستان کا دھندلا سا خواب ایک آنے والی حقیقت کی شکل اختیار کرتا نظر آنے لگا تو وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے لیے اپنے آپ کو ایک نئی مملکت کے تصور پر راضی کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ وہ ضرور اپنے آپ کو ایک عجیب مخمصے میں مبتلا محسوس کرتے ہوں گے کیوں کہ وہ نہ تو ایک ہندو دُنیوی حکومت یعنی ہندوستان کو اپنے لیے پسند کر سکتے تھے نہ پاکستان کو منتخب کر سکتے تھے جہاں اس امر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اعتزال و تفریق کی حوصلہ افزائی کی جائے گی ان کی بعض تحریرات ظاہر کرتی ہیں کہ وہ تقسیم ملکی کے خلاف تھے لیکن اگر تقسیم معرض عمل میں آ جائے تو وہ ملک کو از سرِ نو متحد کرنے کے لیے کوشاں رہیں گے

(رپورٹ انگریزی صفحہ ۱۹۶)

۶۔ ہم نے اس موضوع پر احمدیوں کے سابقہ اعلانات دیکھے ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہمارے نزدیک یہ اعلانات اس کے سوا اور کسی تشریح کے حامل نہیں کہ جو لوگ مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں اب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو مسلمان حضرت رسولِ اقدس و اطہر (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے بعد کسی مامور من اللہ کے دعوے کو قبول نہ کرے وہ اللہ اور رسول کا منکر نہیں لہٰذا وہ امت میں داخل

ہے یہ توجیہ ان کے سابقہ اعلانات سے مختلف نہیں کہ دُوسرے مُسلمان کافر ہیں حقیقۃً یہ الفاظ ان کے سابقہ اعتقاد کی بالواسطہ ازسرِنو تصدیق کرتے ہیں کہ ایسے لوگ صرف اسی معنی میں مسلمان ہیں کہ وہ حضرت رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اُمّت میں سے ہیں اور اس لحاظ سے ایسے سلوک کے مستحق ہیں جو مسلمانوں کے معاشرے کے افراد سے ہونا چاہیے یہ بات یہ کہنے سے بہت مختلف ہے کہ وہ مسلمان ہیں کافر نہیں ۔ (رپورٹ انگریزی صفحہ ۱۹۹)

۷ رجب ۱۹۱۸ء میں انگریزوں نے بغداد فتح کیا تو قادیان میں جشنِ فتح منایا گیا اس بات نے مسلمانوں کے قلوب میں سخت رنج اور تلخی پیدا کر دی اور وہ احمدیّت کو برطانیہ کی لونڈی خیال کرنے لگے (رپورٹ انگریزی صفحہ ۱۹۶)

## عدالت کے ریمارکس

ہمارا منصب یہ نہیں کہ ہم اس بات کا فیصلہ کریں کہ آیا احمدی دائرۂ اسلام سے خارج ہیں یا نہیں ...... ہم اس امر کا فیصلہ غیر احمدیوں پر چھوڑتے ہیں کہ وُہ احمدیوں کی اس نئی پوزیشن کے بعد کہ مرزا غلام احمد نہ کوئی نئی شریعت لایا نہ اصلی شریعت منسُوخ کی وہ صرف ان معنوں میں نبی تھا کہ خُدا نے اسے الہام میں اسی طرح ظاہر کیا تھا کوئی شخص مرزا صاحب کی وحی پر ایمان نہ لانے سے خارج از اسلام قرار نہیں دیا جا سکتا (تلخیص) احمدیوں کو مسلمان سمجھیں یا نہ سمجھیں ؟

## عُلما کی شکست کا سبب

اس میدانِ "مجادلہ" میں علما کو جو شکست ہُوئی ۔ اس کی وجہ مذہب نہیں بلکہ ایک ایسی سیاست تھی جس کے پس منظر میں نصف صدی پُرانی تاریخ ہے ۔ چنانچہ رپورٹ کے بین السطور میں دو متصادم مدرسہ ہائے فکر کی آویزش صاف طور پر جھلکتی ہے ۔

---

لہ چار سے آٹھ نمبر تک کی تلخیصات مولانا مُرتضیٰ احمد میکش کے مجوزہ تراجم سے ماخوذ ہیں ۔

۲ہ مرزائیوں نے انکوائری کمیٹی کے رُوبرُو مسلمانوں سے متعلق جو نئی پوزیشن اختیار کی، اس کی راستی کا اندازہ مرزا غلام احمد قادیانی کے اس فتویٰ سے کیا جا سکتا ہے کہ :— "عدالتی معاملات و بیانات میں اپنے فائدہ اور رہائی کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے"
(ذکرِ حبیب مرتبہ مفتی محمد صادق صفحہ ۶۴)

اوّلاً ملّائیت جو اسلامی معاشرے میں زوالِ بغداد کے بعد ایک ناکارہ عنصر کی حیثیت رکھتی ہے جس نے قرآن کی قوّتِ محرّکہ کو بھی اپنے انجماد سے منسلک کر لیا اور جس کا عقلی تعطّل دینیاتی تفکّر کو محیط ہے۔

ثانیاً جدیدیت جس کی عمر مسلمانوں میں سو برس سے زائد نہیں اس کا دماغ یورپی فلسفے کے اُن عقلی سانچوں میں ڈھلا ہے جو مذہب و سیاست کو دو مختلف خانوں میں رکھتے اور بسا اوقات ایک دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈالتے نظر آتے ہیں ان کے نزدیک مذہب محض عقیدہ ہے اور عقیدہ انسان کا انفرادی معاملہ۔ اس دلچسپ تکرار ہی کا نتیجہ تھا کہ عُلما نے اپنے کہن سال نظریوں سے باہر جھانکنا گوارا نہ کیا اور "فضلا"[ل] نے ان کی سیاسی نامُرادیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُن کے فکر و نظر کی توضیحات قبول نہ کیں۔

## علّامہ اقبالؒ کے نظریات

علّامہ اقبال (علیہ الرحمۃ) کی بالغ نظری کو جدید و قدیم کی اس چپقلش کا تازیست احساس رہا۔ آج سے پچیس برس پہلے آپ نے احمدیّت کے مسئلہ پر جو مضامین لکھے۔ اُن میں کئی جگہ اس عُقدہ کو اپنے ناخنِ فکر سے کھولا ہے، فرماتے ہیں:

> نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ختمِ نبوّت کے عقیدے کی پُوری سمجھ نہیں۔ اُنھوں نے ختمِ نبوّت کے تمدّنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ مغربیت کی ہوا نے اُنھیں حفظِ نفس کے جذبے ہی سے عاری کر دیا ہے
>
> (حرفِ اقبال صفحہ ۱۵۴)

حضرت علّامہ علیہ الرحمۃ کا نُقطۂ نگاہ یہ تھا کہ:

---

[ل] جدید تعلیم یافتہ

۱۔ ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ ۱۷۹۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی روشنی ہی میں احمدیت کے اصل مظروف سمجھے جا سکتے ہیں۔ دُنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۷۹۹ء کا سال بے حد اہم ہے۔ اسی سال ٹیپو کو شکست ہوئی۔ اسی سال جنگ نوارنیو وقوع پذیر ہوئی جس میں ترکی کا بیڑا تباہ ہوا تھا۔ سُلطان ٹیپو علیہ الرحمۃ کے مزار پر مندرجہ تاریخ شہادت اصلاً پیشین گوئی کا درجہ رکھتی ہے :

ذھب عز الرّوم و الھند کلھا

ترجمہ:۔ ہندوستان اور رُوم کی عظمت ختم ہو گئی !

۲۔ سُلطان شہید کی شکست اور مغربی شہنشاہیت کی ایشیا میں آمد کے بعد اسلامی ہندوستان میں چند اہم سوال پیدا ہو گئے۔ مثلاً :

کیا اسلام میں خلافت کا تصوّر ایک مذہبی ادارے کو مُستلزم ہے؟ ہندوستانی مُسلمان اور وہ مُسلمان جو تُرکی سلطنت سے باہر ہیں، تُرکی خلافت سے کیا تعلّق رکھتے ہیں[۱]۔

ہندوستان دار الحرب ہے یا دار السلام ؟

اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے ؟

قُرآن کی آیت "اُولی الامر منکُم" میں منکُم کا مفہوم کیا ہے ؟

احادیث میں مہدی کے وُرُود کی پیشین گوئی کیا نوعیت رکھتی ہے ؟

اسی قبیل کے دُوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے اُن کا تعلّق بداہۃً صرف

---

[۱] لارڈ ولزلی گورنر جنرل ہندوستان نے مسٹر اسپنر برطانوی سفیر مقیم قسطنطنیہ کی وساطت سے خلیفۃ المسلمین سلطان سلیم ثالث والیٔ روم سے ایک سفارشی خط ٹیپو کے نام حاصل کیا۔ جس میں انگریزوں کو دوست قرار دے کر ان سے صلح کر لینے کی خواہش کا اظہار تھا۔ اس کے جواب میں سلطان نے خلیفۃ المسلمین کو لکھا کہ آج کل چونکہ انگریز بہت بڑھے ہوئے ہیں لہٰذا مسلمانوں پر ان سے جہاد فرض ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں سے تھا اور ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے۔ وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا افسوس ناک باب ہیں۔

۲۔ چونکہ مسلمان عوام کو صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربّانی سند ہے۔ لہٰذا غیر ملکی شہنشاہیت کی خدمت گزاری کے لیے ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی جس کو احمدیت نے فراہم کیا۔

مسلمانوں کے مذہبی تفکّر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کے حق میں الہامی بنیاد فراہم کرنا ہے۔

۴۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں جہاں دیگر اقطاعِ ہند کے مقابلے میں پیر پرستی زیادہ مسلّط ہے تحریکِ احمدیت سیاسی دینیات کا درجہ رکھتی ہے بالخصوص پنجاب میں مبہم دینیاتی عقائد کا فسوں دجال اس سادہ لوح دہقان کو آسانی سے مسخّر کر لیتا ہے جو صدیوں سے ظلم و ستم کا شکار ہے۔

غرض احمدیّت دوسرے اسباب کے علاوہ لوگوں کے روحانی افلاس کی پیداوار ہے۔

——— چنانچہ جن مباحث کو انکوائری رپورٹ میں فاضل جج صاحبان نے استفہامی علامت کے طور پر پیش کیا۔ ان پر حضرت علّامہ پچیس برس پیشتر پنڈت جواہر لال نہرو اور روزنامہ "اسٹیٹس مین" دہلی کی تحریروں کے جواب میں قلم اُٹھا چکے ہیں۔ اُن کا ارادہ تھا کہ انگریز قوم کو ایک کھلے خط میں قادیان اور مسلمانوں کی نزاع[1] کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کریں ——— کیونکہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی سے وابستہ تھا۔ فرماتے ہیں :

۱۔ میں کسی مذہبی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا اور نہ قادیانی تحریک کے بانی ہی کا

---

[1] علامہ اقبال نے اپنے مضامین میں اسے قادیانیوں اور مسلمانوں کی نزاع قرار دیا ہے لیکن سی آئی ڈی کے افسرانِ مجاز اس کو احرار اور احمدی نزاع سے تعبیر کرتے ہیں۔

نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ پہلی چیز عام مسلمانوں کے لیے کچھ دلچسپی نہیں رکھتی اور دوسری کے لیے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔

۲۔ مسلمان ان تحریکوں کے معاملے میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہوں چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنائی نبوّت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصوّر کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوّت ہی سے استوار ہوتی ہے۔

۳۔ انسانیت کی تمدنی تاریخ میں ختمِ نبوّت کا تخیّل غالباً سب سے انوکھا تخیّل ہے جس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے موبدانہ تمدّن کی تاریخ ہی سے ہو سکتا ہے۔

۴۔ بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھُلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخرالذکر اسلام کی چند نہایت اہم صُورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے مگر باطنی طور پر اسلام کی رُوح اور مقاصد کے لیے مُہلک ہے۔

۵۔ قادیانی جماعت کی تمام تاویلیں (ختمِ نبوّت سے متعلق) محض اس غرض سے ہیں کہ اُس کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تاکہ اسے سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔

۶۔ ختمِ نبوّت (دوسری خصوصیّتوں کے علاوہ) ایک اجتماعی اور سیاسی لیکن مکمل اور ابدی تنظیم ہے جسے عرفاً اسلام کہتے ہیں۔ محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس سے انکار کُفر کو مُستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعوٰی کرتا ہے وہ اسلام سے غدّاری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیّت کا بانی ایسے ہی الہام کا حامل تھا۔ لہٰذا وہ تمام عالمِ اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔

۷۔ جب میں بانیٔ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ اُن کے دعوائے نبوّت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریکِ احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کرکے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کرتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے رُوحانی مورث کی ختم النبیینی پر متصرف ہو جاتا ہے۔

۸۔ شیخ محی الدین ابنِ عربی کے اس قول پر کہ "ایک مسلمان ولی کے لیے اپنے رُوحانی ارتقا کے دوران میں اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے جو شعورِ نبوّت سے مختص ہو" علامہ فرماتے ہیں اگر شیخ کو اپنے کشف میں یہ نظر آجاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنھیں تصوّف کا شوق ہے ان کی صوفیانہ نفسیات کے پردے میں پیغمبرِ اسلام کی ختم المرسلینی سے انکار کر دیں گے تو وہ یقیناً علمائے ہند سے بھی پہلے مسلمانانِ عالم کو ایسے غدّارانِ اسلام سے مُتنبّہ کر دیتے۔

۹۔ جب کسی قوم کی زندگی میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے۔ ان لوگوں کی قوتِ ارادی پر غور کرو جنھیں الہام کی بُنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ایسے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس مرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصّہ لیا ہے زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہُوئے تھے۔

۱۰۔ قادیانی اور بعض دوسرے مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ قادیانی بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی بیداری سے سخت مضطرب ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہندوستان کے سیاسی نفوذ کی ترقّی سے ان کا یہ مقصد فوت ہو جائے گا کہ پیغمبرِ عرب کی اُمّت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی

اُمّت تیار کریں۔

۱۱۔ احمدیّت اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی لیکن اس قوّتِ ارادی کو فنا کر دیتی ہے جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

۱۲۔ میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سُنا ہے۔

۱۳۔ سیاسی نقطۂ نظر سے وحدتِ اسلامی اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے، جب اسلامی ریاستیں ایک دُوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس وقت جب مسلمان بُنیادی عقائد یا ارکانِ شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا، صرف اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جاسکتی ہے اور بس۔

---

[۱] مرزا محمود احمد اپنے خطبہ مندرجہ "الفضل" قادیان جلد ۲۲، نمبر ۲۸۷ مورخہ ۱۱ جون ۱۹۳۶ء میں فرماتے ہیں:-

(ا) "اگر پنڈت جواہر لال نہرو اعلان کر دیتے کہ احمدیت کو مٹانے کے لیے وُہ اپنی تمام طاقت خرچ کر دیں گے جیسا کہ احرار نے کیا ہُوا ہے تو اُن کا استقبال بے غیرتی ہوتا (قادیانیوں نے ۲۹ مئی ۱۹۳۶ء کو لاہور ریلوے سٹیشن پر پنڈت جواہر لال نہرو کا استقبال کیا تھا) لیکن انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے اُن مضامین کا رد لکھا جو ڈاکٹر صاحب نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علٰحدہ قرار دینے کے لیے سپردِ قلم کیے تھے اور جن میں نہایت عمدگی سے ثابت کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراض نامعقول ہیں"۔

(ب) ڈاکٹر شنکر داس نے لالہ لاجپت رائے کے اخبار "بندے ماترم" میں لکھا تھا ——— مسلمانوں میں اگر کوئی تحریک عربی تہذیب اور پان اسلام ازم کا خاتمہ کر سکتی ہے تو وُہ یہی احمدی تحریک ہے، جب کوئی مسلمان احمدی ہو جاتا ہے تو حضرت محمدؐ سے اس کی عقیدت کم ہو جاتی ہے اور نگاہیں مکّے کے بجائے قادیان پر اُٹھتی ہیں۔

## رواداری کا مفہوم

بعض دوسرے دل فریب مغالطوں کی طرح رواداری بھی انسانیت کے نام پر ایک خوش کن مغالطہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسپینوزا کی "جماعت بدری" پر ڈیورنٹ کی وضاحت کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ:

"جب کسی قوم کی سیاسی وحدت منتشر ہو تو مذہبی وحدت ہی اُس کے وجود کو باقی رکھتی ہے اگر مذہبی وحدت میں انتشار پیدا ہونے کا امکان ہو تو الحاد، غدّاری اور رواداری خودکشی بن جاتی ہے" ——

اس قسم کے معاملات میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں۔ وہ لفظ رواداری کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ وُہ لوگ اس لفظ کو بالکل ہی نہیں سمجھتے رواداری کی رُوح ذہنِ انسانی کے مختلف نُقطۂ ہائے نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ گبن کہتا ہے کہ ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں، ایک رواداری مؤرخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں ایک رواداری مدبّر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مُفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر نوع فکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلّت کو جو اس کی محبوب اشیا یا اشخاص پر کی جاتی ہے برداشت کر لیتا ہے۔ غرض رواداری کی تلقین کرنے والے اس شخص پر عدم رواداری کا الزام لگانے میں غلطی کرتے ہیں جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے جو لوگ اس طرزِ عمل کو غلطی سے اخلاقی کمتری خیال کرتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ اس طرزِ عمل میں حیاتیاتی قدر و قیمت مُضمر ہے ——

آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان جو مسلمانوں کے دینی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔

لفظِ کُفر کے غیر محتاط استعمال کو بھی ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصوّر کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصوّر ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دُوسرے پر الحاد کا الزام لگانا باعثِ انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکّر کو مُتحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اس کا اعتراف پروفیسر ہرگرانج نے بھی کیا ہے۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وُہ معاندانہ قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے اور جس شخص کو اصل جماعت میں تلعّب بالدّین کرتے پائے۔ اس کی مزاحمت کے تیار رہو، پھر کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے۔ حالانکہ اس کی وحدت خطرے میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پُوری اجازت ہو، اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دُشنام سے لبریز ہو

## علیحدگی کا مطالبہ

۱۔ اگر کوئی گروہ جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے اور حکومت کے لیے مُفید ہے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پُوری طرح مجاز ہے لیکن خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کرے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔ تو یہ ایک عبث توقع ہے ــــــــــ

۲۔ میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وُہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مُطابق ہوگا اور مُسلمان اُن سے ویسی ہی رواداری سے کام لیں گے جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتے ہیں۔

۳۔ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیشِ نظر جو اُنھوں نے مذہبی اور مُعاشرتی مُعاملات میں ایک نئی نبوّت کا اعلان کرکے اختیار کی ہے۔ خود حکومت کا فرض ہے کہ وُہ قادیانیوں

اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی قدم اُٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب اُن کی علیحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۴۔ اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے، جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ رسالت پر ایمان، دراصل یہ آخری یقین ہی وُہ حقیقت ہے جو مسلمان اور نامسلمان کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔ ایران میں بہائیوں نے ختمِ نبوّت کے اصُول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ وُہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔

۵۔ ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دُنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویّے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانیٔ تحریک نے ملّتِ اسلامیہ کو سڑے ہُوئے دُودھ اور اپنے پیروؤں کو تازہ دُودھ سے تشبیہ دی ہے۔ اُن کا بُنیادی اصُولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام جمہور المسلمین سے اجتناب، اُن کی نمازوں سے قطعِ تعلّق، نکاح وغیرہ کے معاملوں میں مقاطعہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دُنیائے اسلام کافر ہے۔ مُسلمانوں سے اُن کی علیحدگی پر دال ہے۔

۶۔ اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی اختیار کرتے ہیں تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟

۷۔ ملّتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پُورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے اگر حکومت نے یہ مُطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے؟

۸۔ قادیانیت مسلمانانِ ہند کی حیاتِ ملّی کے لیے اسپینوزا کی اس مابعد الطبیعات سے زیادہ خطرناک ہے جس سے یہود کو خطرہ تھا۔

۹۔ جب کوئی شخص اپنے ان ملحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے۔ جن سے نظامِ اجتماعی خطرے میں پڑ جائے تو ایک آزاد اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد کرے گی۔

## اسلامی ریاست کا طرزِ عمل

—— لیکن آزاد اسلامی ریاست نے اس بارے میں جس طرزِ عمل کو پسند کیا وُہ انگریزوں سے زیادہ افسوسناک ہے لسے اِس اغماض کے نتائج کا احساس ہی نہیں کہ اِس قسم کی رواداری سے یہاں کوئی سا مذہبی سٹّے باز بھی اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور مسلمانوں کے سیاسی تجربے کی تاریخ میں مذہب و سلطنت کی علیحدگی محض وظائف کی علیحدگی ہے نہ کہ عقائد کی۔[1] (دیکھو حرفِ اقبال)

اب اگر ان قاطع دلائل اور واضح براہین کے بعد بھی (جن کے مصنف پاکستان کے نقاش علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ہیں) احرار پر یہ تہمت باقی رہ جاتی ہے کہ اُنھوں نے سیاسی اغراض[2] کے تحت تحریکِ ختمِ نبوّت کو جنم دیا اور ان کے پیشِ نظر پاکستان کی بربادی کے مقاصد تھے تو اس کو زیادہ سے زیادہ پولیس کی ایک روایتی ضمنی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ——

---

[1] علامہ اقبال کے تمام اقتباسات اُن کے اُن مضامین سے ماخوذ ہیں جو اسلام اور قادیانیت کے موضوع پر آپ نے وقتاً فوقتاً سپردِ قلم کیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "حرفِ اقبال" از صفحہ ۱۲۱ تا ۱۷۹۔

[2] رپورٹ میں احرار کے سیاسی اغراض کا بار بار ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مہمل اصطلاح ہے۔ شاہ جی اغراض تو ایک طرف رہے، سیاسیات ہی سے بے نیاز ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد احرار میں جو دو چار سیاسی کارکن رہ گئے بالفرض وہ کوئی سیاسی غرض رکھیں تو ان میں صفِ دوم کا سیاست دان بھی کوئی نہیں اور نہ اُن کی ذہنی سطح اتنی بلند ہے کہ وُہ کوئی "سوانگ" رچا کر اغراض حاصل کر سکیں اور اگر اغراض ہی مقصود ہوں تو سیاسیات کی راہ سے بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

اب رہا یہ ارشاد جیسا کہ فاضل جج صاحبان نے رپورٹ کے اواخر میں لکھا ہے کہ "احراریوں سے ایسا برتاؤ کیا گیا، گویا وہ خاندان کے افراد ہیں اور احمدیوں کو اجنبی سمجھا گیا" (صفحہ ۲۲۴) تو اس کی بالواسطہ بنیاد بھی تحریک پاکستان کے بالکل ابتدائی دور میں مل جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی سے منسوب ایک تقریر پر کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" ایک جوابی مضمون (مطبوعہ روزنامہ احسان ۹ مارچ ۱۹۳۸ء) میں لکھا تھا کہ:

"مولانا حسین احمد مدنی یا اُن کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکار خاتمیت کا نظریہ۔ بظاہر نظریۂ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی انکار خاتمیت الٰہیات کا ایک مسئلہ ہے، لیکن ان دونوں میں ایک گہرا تعلق ہے"۔۔۔۔۔

مولانا حسین احمد مدنی نے اعلان کیا کہ مجھ سے جو الفاظ منسوب کیے گئے ہیں وہ غلط ہیں۔ اس پر حضرت علامہ نے اشعار کے لیے معذرت کر لی۔ لیکن یار لوگوں نے اشعار تو ان کی رحلت کے بعد "ارمغانِ حجاز" میں شریک کر لیے مگر معذرت کو بالارادہ غائب کر دیا۔ حد یہ کہ جس شدت سے مولانا حسین احمد مدنی اور اُن کی جماعت کے خلاف سیاسی پلیٹ فارم سے پراپگنڈا کیا گیا، مرزا غلام احمد اور قادیانی جماعت کے خلاف اس کا سواں حصہ بھی ان حلقوں میں مفقود ہے اور تو اور خود اقبال کے مدرسۂ فکر نے اس کو چھوا تک نہیں۔ اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ چنانچہ اس کا صحیح اشارہ ہمیں ایک غیر سیاسی لیکن مشہور طنز نگار جناب رشید احمد صدیقی پروفیسر علی گڈھ یونیورسٹی کے ہاں ملتا ہے وہ اپنے ایک مقالہ "نیا ادب میری نظر میں" میں لکھتے ہیں:

"ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں مذہب کی وہ اہمیت و عظمت نہیں جو۔۔۔۔

اہمیت عظمت سیاسی لیڈروں کی ہے مسلم لیگ اور کانگرس دونوں خالصۃً سیاسی اوارے ہیں اور سیاسی توازن یا تفوق ہی کے لیے سرگرم عمل ہیں ان کا مذہب و اخلاق سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک مذہب کے احیا کا تعلق ہے نہ ہندو سرفروشی کے لیے آمادہ ہیں نہ مسلمان اور نہ کوئی اور قوم البتہ مذہب کے نام اور قوم کی حیثیت سے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے سخت بیزار ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذہب سے وہ شغف نہیں جو وارفتگی ہندوؤں کو مہاتما گاندھی اور مُسلمانوں کو قائدِ اعظم محمدؐ علی جناح سے ہے"۔

("نیا ادب میری نظر میں" صفحہ ۱۱۲، ۱۱۳ - مرتبہ آغا سرخوش قزلباش)

——— غرض شاہ جی کے خلاف جو کچھ لکھا گیا، اس پر تاسف تو ہے تعجب نہیں۔ کیونکہ اس نزاع کے پس منظر میں "احراری، احمدی مسئلہ" کے بجائے خاص قسم کے رُجحانات کارفرما تھے، بہرحال شاہ جی کی سیرت کے یہ اوراق کبھی حذف نہیں ہو سکتے کہ اُنھوں نے سالہا سال کی اَن تھک جد و جہد سے کام لے کر مسلمانوں کے دل و دماغ سے قادیانیوں کو نہ صرف خارج کیا بلکہ اُنھیں ایک مذہبی سارق کے درجے میں لا کھڑا کیا ہے[۱]۔ اور اب سیاسی حیثیت سے وُہ ایک غیر سرکاری اقلیت ہیں کیونکہ اُنھیں مسلمانوں کے کسی حلقۂ انتخاب میں بھی انتخابی قوت حاصل نہیں! ——— البتہ حکمران جماعت اُنھیں ضرور مُسلمان تسلیم کرتی ہے

---

احرار نے ہمارے خلاف جو شورش پیدا کی ہے۔ اس سے ڈر کر سارے مسلمانوں نے ہم کو علیٰحدہ کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ چودھری ظفر اللہ خان سے گورنر پنجاب نے کہا تھا کہ آپ کے مخالف صرف احرار ہی نہیں بلکہ سب قوموں اور فرقوں کے لوگ میرے پاس آ آ کر شکایتیں کرتے ہیں۔ (خطبہ خلیفۂ قادیان مطبوعہ "الفضل" ۵ دسمبر ۱۹۳۸ء)

——— ایک معتبر دوست کی ثقہ روایت ہے کہ احرار کی قادیان پر یلغار کو مرکوز کرانے کے لیے چودھری سر ظفر اللہ خان کی والدہ محترمہ نے بذاتِ خود لارڈ ولنگڈن سے شکایت کی اور گورنر پنجاب کو ڈانٹ پلوا کر حدودِ قادیان میں احرار کانفرنس کو بند کروایا تھا۔

احرار کی سیاسی شکستوں کے پہلو بہ پہلو جب اُن کی ذہنی فتح مندیوں کے یہ نقش و نگار اُبھاگر ہوتے ہیں تو علامہ اقبال کی یہ بات زیادہ صاف ہو کر سمجھ میں آتی ہے کہ :

"جو لوگ اپنے صحیح رجحانات پر اعتماد کر کے میدانِ عمل میں کُود پڑتے ہیں، اُن سے غلطیاں بھی ہُوا کرتی ہیں لیکن تاریخ اقوام بتلاتی ہے کہ اُن کی غلطیاں بھی بعض اوقات مُفید نتائج پیدا کرتی ہیں کیونکہ اُن کے اندر منطق نہیں بلکہ زندگی ہیجان برپا کرتی ہے ——"

---

# لاثانی خطیب

شاہ جی اور خطابت ہم نشین ہیں۔ پچھلی چار دھائیوں میں اُردو زبان نے اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں کیا۔ جہاں بڑے بڑے زبان آوروں کی متاعِ سخن ختم ہو جاتی ہے وہاں سے اُن کی خطابت شروع ہوتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام "سرودِ زندگی" کی "تقریب" میں شاعری کو اکائی فرض کر کے لکھا ہے کہ ان کا کلام نصف شاعری ہے۔ اس خیالِ مستعار کے حوالے سے یہ بات بے تردید کہی جا سکتی ہے کہ شاہ جی کی خطابت نصف خطابت ہے۔ جس طرح قلم کا تصور بغیر تحریر بیکار ہے۔ اسی طرح شاہ جی کے بغیر خطابت اور خطابت کے بغیر شاہ جی کا تصور بے رنگ ہے۔ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اس برصغیر کی ایک تہائی صدی اُن کی آوازوں سے معمور ہے جس فیاضی سے انھوں نے مرحوم ہندوستان میں اپنی خطابت کے موتی بکھیرے ہیں، کوئی دوسرا مقرر اس میدان میں اُن کا ہم پایہ نہیں ہے غرض کلکتہ سے لے کر خیبر تک اور سری نگر سے لے کر راس کماری تک اُنھوں نے اپنے بادۂ صافی کے خُم پر

خُم لنڈھائے ہیں۔ شاذ ہی کسی بادہ گسار کو شکایت ہوگی کہ عالمِ نشہ و سرور کی ان رعنائیوں میں اسے کوئی حصہ نہیں ملا ہے۔

سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے رمضان کے تیس یا اُنتیس دن اور عید و بقر عید وغیرہ چھوڑ کر باقی تین سو دن ایسے ہوتے ہیں جو اُنھوں نے چالیس برس تک خطابت کی دشت پیمائی میں بسر کیے ہیں۔ اس میں سے قید کے نو یا دس سال نکال دیں تو بتیس برس ایک عام پاکستانی یا عام ہندوستانی کی اوسط عُمر کا سرمایا ہے۔ ان تیس بتیس برس میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے کئی دفتر مرتب ہو سکتے ہیں۔

چراغ خونِ جگر سے جلائے ہیں ہم نے

## خطابت کا آغاز

اُردو خطابت کا صحیح آغاز دیوبند اور علی گڈھ کی تحریکوں کے ابتدائی دور سے ہوتا ہے۔ مُدت العمر خطابت کا تصوّر تحریری رہا۔ ڈپٹی نذیر احمد اس میدان کے یکّہ تاز تھے۔ خطابت کا سیاسی عوامی تصوّر تحریکِ خلافت اور تحریکِ لاتعاون کے تقاضوں کی بدولت پیدا ہوُا اور مقرروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی۔ جس کا اس سے پہلے کوئی وجُود نہ تھا اور اگر کہیں کوئی وجُود تھا تو وُہ مُقرر نہیں واعظ تھے۔ اسی طرح عوامی خطابت کا تصوّر اصلاً سیاسی تحریکوں اور جمہوری اداروں کے نشو و نما کا نتیجہ ہے۔ پہلی جنگِ عظیم نے معاشرے کی ایک بہت بڑی عمارت کو ہلا ڈالا جس سے نہ صرف مسلمانوں کی جذباتی وابستگیوں کے بہت سے قلعے ڈھے گئے بلکہ انھیں بعض سخت قسم کی حیرانیوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن دُنیا کے ساتھ ہندوستان نے بھی تبدیلیاں قبول کیں جس سے سارا ملک حالات کی ایک نئی گرفت میں آگیا۔ ہندوستان نہ صرف سیاسی تحریکوں کی خصوصیتوں سے آگاہ ہوا بلکہ اس تیزی سے اُنھیں اپنایا کہ امزجہ و طبائع کا سرایا ہی بدل

گیا۔ کئی رنگا رنگ خیال پیدا ہونے لگے جن سے جوش و ہیجان کے وہ ادارے سامنے آ
گئے جنھیں عوامی زبان میں جلسہ جلوس مظاہرے اور مجاہرے کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر
تحریک ایک تقاضے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ تقاضا نتیجہ ہوتا ہے خاص قسم کے جذبات کا۔
ان جذبات نے ہندوستان میں خطابت ایک ایسے سکول کی بنیاد رکھی جس نے نہ صرف مقرروں
کی ایک بڑی جماعت پیدا کی بلکہ اپنے خصائص و محاسن سے عوامی غور و فکر کی راہیں ہی بدل
ڈالیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا ان میں کئی راہنماؤں نے نام پیدا کیا جن میں مولانا ابوالکلام
آزاد کو اُن کے علم و نظر کی وسعتوں اور مولانا محمد علی جوہر کو اُن کی قائدانہ صلاحیتوں نے صف
اول کے مقرروں میں لا کھڑا کیا لیکن شہسواری کا سہرا شاہ جی کے سر ہی رہا۔ مولانا ابوالکلام
آزاد نے زیادہ تر اجتناب کی زندگی بسر کی اور بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ دماغی خلوتوں
سے باہر قدم رکھا۔ اُنھوں نے اپنی خطابت کا ایک دبدبہ اور احترام تو قائم کر لیا لیکن اپنے
آپ کو عوامی خطابت کی سطح پر کبھی نہ لا سکے۔ مولانا اس معاملے میں ایک ایسے شکاری رہے
ہیں جس کا نشانہ شاہینوں اور کبوتروں پر یکساں بیٹھتا ہے۔

محمد علی جوہر انگریزی اور اردو میں یکساں دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ کی طلاقت
لسانی میں جلال و جمال دونوں تھے مگر علم و نظر کا وہ بہاؤ نہ تھا جو مولانا ابوالکلام آزاد
کے ہاں وافر رہا، گویا آپ کی شخصیت کے اُجالنے میں قیادت اور خطابت باہم گتھ گئے
تھے۔ ان دونوں کے برعکس شاہ جی کے ہاں خطابت کے سوا دوسری تمام خصوصیتیں ثانوی ہیں
بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ خطابت ہی کی پیداوار ہیں ——— جس طرح ہر بڑے آدمی
کی خصوصیت اُس کا نام لیتے ہی حافظے کی لوح پر آ جاتی ہے مثلاً غالب کا نام لیتے ہی ایک
عظیم شاعر کا تصور بندھتا ہے۔ اس طرح شاہ جی کی ذات خطابت سے مختص ہو گئی ہے وہ

سراپا خطابت ہیں۔

شاعروں کی طرح خطیب بھی قدرت سے انعام لے کر پیدا ہوتے ہیں، وہ کسی اختیاری سانچے میں نہیں ڈھلتے بلکہ ان کا ملکہ بھی وہبی ہوتا ہے۔ اُن کی دماغی بناوٹ میں خطابت کے خصائص از خود منضبط ہوتے ہیں پھر اس خام مواد کو مُطالعہ، مُشاہدہ اور تجربہ پروان چڑھاتا ہے۔ شاہ جی پیدائشی خطیب ہیں اُنھوں نے خطابت کو اختیار نہیں کیا بلکہ خطابت نے اُنھیں اختیار کیا ہے وہ تمام محاسن و محامد جن سے خطابت استوار ہوتی ہے، قدرت نے ان میں بکمال و تمام ودیعت کیے ہیں وہ اپنی اسی فنی عظمت کے باعث دُنیا کے اُن بڑے مقرروں میں جگہ پاتے ہیں جن کا نام ہمیشہ کے لیے جریدۂ روزگار پر ثبت ہے۔

**صحیح تصویر**

ارسطو نے ایک خطیب کے جو محاسن بیان کیے ہیں۔ اُن سے علامہ ابن رشد نے جو تلخیص مرتب کی ہے اس تلخیص پر فارابی اور ابن سینا نے جو مضامین حوالۂ قلم کیے ہیں اور اب ڈیماستھنیز (۳۲۲ ق م) اور سسرو (۱۰۶ ق م) وغیرہ کے سوانحی خطوط سے خطابت کے جو اصول معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ اڈمنڈ برک جہان ابن غزال اور سعد زغلول وغیرہ کے مطالعے سے خطابت کی جن راہوں پر قدم اٹھتے ہیں اس گئے گزرے دور میں شاہ جی اُن کی صحیح تصویر ہیں۔ اُنھوں نے اس میدان میں ہر جہت سے ملک و قوم کی خدمت کی ہے۔ غالباً علامہ ابن تیمیہؒ کے متعلق روایت ہے کہ اُن کی زندگی میں صرف دو راتیں ایسی آئی تھیں جو مطالعہ سے خالی رہ گئیں۔ پہلی عروسی کی رات دوسری جب ان کے والد کا انتقال ہُوا تھا

——— شاہ جی نے سی سالہ خطابی زندگی کی ننانوے فی صد راتیں عوام سے مخاطبت میں بسر کی ہیں۔ اُنھوں نے مذہب، سیاست، زبان تینوں کی خدمت کی ہے۔

اگر وہ روایتی تبلیغی زندگی بسر کرتے تو سارا ہندوستان اُن کے قدموں پر ہوتا۔ خود مسلمان قوم اُن کی مُورتی تراش لیتی لیکن انھوں نے سالہا سال مذہب کے نام پر تراشے گئے بُت توڑے ہیں۔ اس مہم میں اُنھیں ایسی ایسی جگہ جانا پڑا جہاں مسلمان کہلانے والے تو موجود تھے لیکن اُن کے نام تک مُسلمان نہ تھے۔ اسی پنجاب میں بے شمار آبادیاں ایسی تھیں جہاں مسلمانوں کو کلمۂ شہادت تو ایک طرف رہا السلام علیکم کہنا نہ آتا تھا۔ ان میں ہندو مت کے زمانۂ زوال کی رسمیں عقیدہ کے طور پر مُروج تھیں۔ ان میں مذہب ایک آبائی ورثہ رہ گیا تھا۔ کئی علاقوں میں صُورتِ حال کا نقشہ یہ تھا کہ غیر اللہ کی پرستش ہی کو اصل اسلام سمجھا جاتا —— شاہ جی نے ان دُور افتادہ علاقوں کا قصد کیا تو ان کی راہ میں بیسیوں موانعات تھے۔ ایک حصّہ ریل میں طے کیا تو دُوسرا لاری میں، تیسرا گھوڑے کی پیٹھ پر، چوتھا پیدل، پھر کئی دفعہ میلوں پیدل ہی چلتے گئے۔ اب جس علاقے میں جاتے ہیں وہاں کے عام لوگ آپ کی زبان نہیں سمجھتے۔ کچھ دن وہاں رہ کر مقامی لفظوں کا ایک ذخیرہ فراہم کیا۔ تب ایک دل چسپ خطابت تگ و دو کے بعد ان کے دل و دماغ کو راضی کیا۔ غرض اس باب میں ان کے کارنامے بڑے ہی قابلِ قدر ہیں مثلاً:

## قابلِ قدر خدمات

۱۔ انھوں نے پنجابی مسلمانوں کے بعض علاقوں کی خطرناک مذہبی بد اعتقادیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جس سے بے شمار مُسلمانوں کو فائدہ پہنچا۔

۲۔ جن علاقوں میں وضعی پیروں اور مصنوعی گدّیوں کے خرابات تعمیر تھے مثلاً مُلتان، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ وغیرہ، وہاں علی التواتر نعرۂ رُستاخیز بلند کیا۔ جس سے ایک بڑی آبادی کا ایمان محفوظ ہو گیا۔ ورنہ ان علاقوں میں اس قسم کے عقیدے راسخ تھے کہ پیروں کو

اللہ و رسولؐ سے افضل سمجھا جاتا۔ ان کے نفس کی نسوانی غذا کو حلال اور ان کی قدم بوسی کو مباح، قرآن پر قوالی کو ترجیح دی جاتی۔ عام فرزندانِ طریقت کسانوں کی بیٹیوں کو للکارتے کہ نبی کی بہو بننا پسند کرو گی

۳۔ قرآن کی بجائے دیہات میں "یوسف زلیخا"، "ہیر رانجھا"، "سوہنی مہینوال" اور "مرزا صاحباں" کے عشقیہ قصے عقیدۃً حفظ کیے جاتے تھے۔ آپ نے اس بد مذاقی کا طلسم توڑا اور ان کی جگہ قرآن حکیم کی تلاوت کو عام کیا۔

۴۔ غربا میں بہ مقابلہ اُمرا احساس کمتری چھوت چھات کے درجے تک موجود تھا۔ اس کی مزاحمت کی اور غریبوں کو حفظِ نفس پر آمادہ کیا۔

۵۔ جن علاقوں میں مسلمان تجارت کو چھوتے نہیں تھے وہاں لگاتار کوششوں سے تجارت کا ذوق پیدا کیا اور بے شمار بستیوں میں مسلمانوں کی دکانیں کھلوائیں۔

۶۔ پنجاب کے عام مسلمان معاشی اعتبار سے اس قدر پس ماندہ تھے کہ مظفر گڑھ اور میانوالی کے بعض مسلمان مزارعین نے ہندو ساہوکاروں کے پاس اپنی بیٹیاں گروی رکھ کر مالیہ ادا کیا تھا۔ جہاں ان بچیوں نے مہاجنوں کے گھروں میں بچے جنے تھے۔ شاہ جی نے ان سانحات کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں میں مجلسی یا معاشی فروتری کا جو احساس جڑ پکڑ چکا تھا اس کی بنیادیں اُکھاڑ دیں۔

۷۔ عام مسلمانوں کو قرآناً اور اسلاماً سمجھایا کہ انسانی فضیلت کی بنیادیں خاندانی تفاخر پر قائم نہیں ہوتیں بلکہ ہر انسان اپنے علم و دیانت اور زہد و تقویٰ کے باعث قابلِ تکریم ہوتا ہے

۸۔ انگریزوں نے مُلّا کو تلقینِ جہاد کی پاداش میں سماج کے گھسیاروں کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا یعنی خوانینِ علاقہ انھیں کمین سمجھ رہے تھے اور امتدادِ زمانہ نے انھیں ٹکڑگدا بنا دیا تھا

آپ علما کی اس اہانت کے خلاف نہ صرف سینہ سپر ہو گئے بلکہ اُن کی بحالیٔ عزت کو اپنے اُوپر فرض کر لیا۔

۹۔ تمام صوبے میں بے شمار دینی مدرسے کھلوائے اور اُنھیں خود مکتفی بنانے کے لیے عامۃ المسلمین سے زرِ اعانت فراہم کیا۔

۱۰۔ قرآن مجید کی بعض آیات کے ان غلط ترجموں کو افشا کیا جن میں انگریزوں کی مصلحتوں کو مقدم رکھا گیا تھا۔

۱۱۔ کلام اللہ کی ان آیات کو تقریروں میں بیان کرنا شروع کیا جنھیں ایک مدت سے زخم رسیدہ علمانے انگریزی دبدبے کے خوف سے طاقِ نسیان پر رکھ چھوڑا تھا۔

۱۲۔ انگریزوں کی غدر میں فتوحات کے بعد عیسائی مشنریوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ اُنھوں نے حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اپنی بدگوئی کا مرکز بنا رکھا تھا جس سے ہفوات کا ایک لایعنی دفتر تیار ہو گیا۔ اس فتنے کے بانی یو پی کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور تھے ان کی دیکھا دیکھی ہندوؤں بالخصوص آریہ سماجیوں نے بھی مُنہ کھولا جس سے بالآخر شدھی کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس تحریک نے لیکھ رام اور راجپال پیدا کیے شاہ جی نے ناموسِ پیغمبرؐ کی حفاظت کا ایک ایسا ذہن تیار کیا کہ راجپال کی ورتمان دہنی پر جسٹس دلیپ سنگھ کا فیصلہ، تعزیراتِ ہند میں نہ صرف ۱۹۲ الف کے اضافہ کا موجب بنا بلکہ مسلمانوں نے اس فرض کو اپنے ہاتھوں پُورا کر کے ان بدسگالوں کا راستہ روک لیا جن کی بے قابو زبانیں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قینچی کی طرح چلتی تھیں۔

۱۳۔ مبلغین کی ایک ایسی جماعت تیار کی جس نے نہ صرف بدعات کے خلاف جہاد کیا بلکہ منکرات کی راہ روک لی۔ اس سے بُنیادی اجتماعی فائدہ یہ پہنچا کہ مسلمانوں میں اسلامیات سے

دماغی شغف کا رشتہ مقابلۃً مضبوط ہو گیا۔

وقت کے نامور علما کو شاہ جی کی ان دینی خدمات کا ہمیشہ اعتراف رہا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے تھے: "شاہ جی کی باتیں تو عطارالٰہی ہوتی ہیں"۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا ارشاد تھا: "شاہ جی آپ تو اسلام کی مشین ہو۔"

## سیاسی خدمات

۱۔ مسلمانوں میں خصوصیت سے اینٹی برٹش ذہن کی آبیاری کی جس سے ایک بڑے گروہ میں خلافِ استعمار جذبہ استوار ہوتا گیا۔

۲۔ پنجاب بالخصوص دیہات میں انگریزی حکومت کے کارندوں کا جو رعب تھا اس کو زیادہ سے زیادہ خاک بسر کیا اور خوانین کی ہیبت کا حصار توڑا۔

۳۔ جماعتِ احرار کو ایسی تحریک بنایا جسے عرفِ عام میں اسلامی بنیادوں پر طبقاتی شعور کی تحریک کہا جا سکتا ہے۔

۴۔ پنجاب انگریزوں کے استعماری مقاصد کی چھاؤنی تھا۔ اس چھاؤنی کے عسکری ذہن میں دراڑ پیدا کی۔

۵۔ شہری زندگی کے انگریز دوست عناصر پر لگاتار تابڑ توڑ حملے کیے، جس سے نہ صرف ان وفادار خاندانوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی بلکہ رفتہ رفتہ عامۃ الناس میں وہ ایک سیاسی گالی ہو گئے۔

۶۔ وہ مخصوص خاندان جو مسلمانوں کی حیاتِ ملی پر چھائے ہوئے تھے۔ انھیں اس التزام سے لتاڑنا شروع کیا کہ قوم کے ایک حصہ کا اندازِ فکر ان خاندانوں کے حصرِ مقاصد سے باہر آ گیا۔

۷۔ مسلمانوں کی قومی زندگی میں اجتماعی نظام کی راہ پیدا کی اور انھیں احساس دلایا کہ

اُن کے بہت سے ایسے بنیادی حقوق بھی ہیں جنھیں انگریزوں نے غصب کیا تھا اور جو اُنھی سے واپس طلب کیے جا سکتے ہیں۔

غرض سیاسیات میں خطابتی اعتبار سے ان کا وُہی رول رہا جو ادبیات میں جوش ملیح آبادی کا ہے لیکن دونوں کا فرقِ مراتب ظاہر ہے۔ جوش کو شاہ جی سے کوئی نسبت نہیں۔ گاندھی جی فرماتے تھے: "شاہ جی! آپ تو لوگوں پر جادو کرتے ہیں"۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ارشاد تھا: "میرے بھائی آپ کے زورِ بیان پر مُلک و قوم کا ہر گوشہ شکر گزار ہے"۔

## بے مثال ساحر

مولانا محمد علی کے زیرِ صدارت ۱۹۲۶ء میں ایک جلسۂ عام دہلی دروازہ لاہور کے باغ میں منعقد ہُوا۔ اس جلسہ کے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے مولانا نے "ہمدرد" میں لکھا تھا: "کامیابی کا سہرا اس بے مثال مقرر کے سر رہا، جن کا نام سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری ہے۔ ان کی قرآن خوانی، ان کی اردو، ان کی پنجابی، ان کی متانت ان کی ظرافت غرض ہر چیز نے سامعین کو مسحور کیے رکھا۔ لوگوں کا تقاضا تھا کہ شاہ صاحب اپنی تقریر جاری رکھیں۔ شاہ صاحب بھی تیار تھے۔ مگر میرے کہنے سے انکار کر دیا۔ جلسہ غالباً دو بجے شب ختم ہُوا۔ ورنہ وہیں صبح ہو جاتی"۔

"زمیندار" میں بھی مولانا کے ان تاثرات کا خلاصہ چھپا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"شاہ جی! تم نے لوگوں پر جادو کر دیا تھا، وُہ تمھاری تقریر سے اتنے بے خود تھے کہ تم اُن سے کوئی غلط کام کرانا چاہتے تو فوراً کر بیٹھتے۔ جو قدرت تم کو اپنی زبان پر ہے وہ خداداد ہے بلکہ خُدا کی ایک بڑی نعمت لیکن یہ نعمت خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ عوام کے سامنے ہر مسئلہ کے دو رُخ پیش کر دیا

کرو تاکہ ان کی قوتِ فیصلہ میں ترقی ہو ورنہ تم پر ایک ایسی مسئولیت عائد
ہوتی ہے جس کا نتیجہ خوبی کے ساتھ خرابی بھی ہو سکتا ہے"۔

اور شاہ جی فرماتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا تھا :

"بھائی اگر تم لوگوں کے لیے مرغن غذاؤں کا یہ دستر خوان بچھاتے
رہے تو ہمارے ساگ ستّو کو کون پوچھے گا"؟

## لسانی خدمات

تقریباً سبھی خطبا میں زبان و بیان کی سجاوٹ ہوتی ہے مگر وہ لسانیات میں تخلیقی حصّہ نہیں لیتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان اس سے مستثنیٰ ہیں اور اس کی وجہ ان کا ادیب ہونا ہے۔ ان ہر سہ حضرات نے جس کے تذکرے کا یہ محل نہیں، اُردو زبان کو سیکڑوں سیاسی الفاظ اور سیاسی مصطلحات دی ہیں بلکہ اردو کا سیاسی لغت تیار کرنے میں ان حضرات کا نمایاں حصّہ ہے لیکن شاہ جی نے محض ایک خطیب ہو کر اردو کو بہت کچھ دیا ہے :

۱۔ انھوں نے اُردو خطابت میں بے ساختہ پن پیدا کیا اور اپنے طرزِ بیان سے ثابت کیا کہ نفاستِ زبان ہی خطابت کا حقیقی جوہر ہے۔

۲۔ بعض سیاسی حالات کی مطابقت سے بیسیوں محاورے اور کتنی ہی اچھوتی ترکیبیں ایجاد کیں جن کا اس سے پہلے اُردو میں تصور تک نہ تھا۔

۳۔ جن علاقوں (بالخصوص پنجاب کے شمال مغربی اضلاع) میں اردو کا وجود اجنبی تھا، وہاں نہ صرف اردو کا مذاق عام کیا بلکہ لوگوں کو شوق دلایا کہ وہ اُردو کو دفتری ضرورت کی بجائے قومی ثقافت کا حصّہ سمجھیں۔

۴۔ اردو کو پنجابی خاندانوں کے ڈرائینگ رُوموں سے نکالا اور کوچہ و بازار تک

پہنچانے میں گراں قدر حصّہ لیا۔

۵۔ مولانا ابوالکلام کی انشا اور شاہ جی کی خطابت میں واضح تفاوت کے باوجود ایک گونہ مماثلت ہے۔ مولانا کی تحریروں میں عبارت کے ہر موڑ پر اساتذہ کے اشعار نگینے کی طرح جڑے ہوئے ملتے ہیں۔ شاہ جی کی تقریروں میں برجستہ شعر اس طرح وارد ہوتے ہیں کہ ان کی چمک دمک میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مولانا اپنی تحریروں کو قرآن مجید کی آیات سے مرصّع فرماتے ہیں، شاہ جی تقریروں میں ہیرے کی طرح ٹانکتے ہیں۔

## اقسامِ خطابت

آج خطابت کئی شکلوں میں بٹ گئی ہے۔ انگریزی ادب میں اس کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ عوامی خطابت

۲۔ پارلیمانی خطابت

۳۔ مباحثاتی خطابت

۴۔ ضیافتی خطابت

لیکن بعض مشرقی نقاد اس میں مزید تنوع اور وسعت پیدا کرتے ہیں:

اوّلاً۔ علمی مقرر، جو علم و نظر اور فلسفہ و فکر کے مسائل پر بولتے ہیں۔

ثانیاً ادبی مقرر، جن کا میدان شعر و ادب تک محدود ہوتا ہے۔

ثالثاً سیاسی مقرر، جو موقتہً سیاسی مسائل پر سوچ بچار کا ذہن تیار کرتے ہیں۔

رابعاً پارلیمانی مقرر، جو دستوری مقرروں ہی کی توآم شاخ ہیں اور جن کی تگ و دو کا میدان مجالسِ مقننہ میں ہے۔

خامساً ضیافتی مقرر، جو کلام بعد از طعام کے مظہر ہوتے ہیں۔

سادساً، عوامی مقرر، جو سیاسی تحاریک پیدا کرتے اور عوام کالانعام میں وحدتِ خیال پیدا کر کے انھیں حرکت و عمل کی راہ پر لاتے ہیں۔

سابعاً، مذہبی مقرر، جنھیں واعظ بھی کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا دائرہ بیان دینیات کے ایمانیاتی پہلو تک محدود ہوتا ہے۔

شاہ جی دستوری مقرر تو قطعاً نہیں لیکن دوسری تقریباً تمام خصوصیتوں میں سربرآوردہ ہیں۔ اس سارے دور میں اُن سے بڑا عوامی خطیب ناپید ہے۔ جو چیز خطابت میں مقدم سمجھی جاتی ہے، وہ آواز ہے اور آواز بھی سانچے میں ڈھلی ہوئی پاٹ دار۔ دوسرا درجہ زبان میں مہارت کا ہے۔ شاہ جی قدرت کے ان دونوں تحائف سے بہرہ ور ہیں۔ ان کی آواز میں گھن گرج کے علاوہ ایک سج دھج ہے۔ ان کے گلے کی غراریاں ساؤنڈ مشین کی طرح کام کرتی ہیں۔ انھیں الفاظ کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ آواز کے نشیب و فراز کا محل استعمال معلوم ہے۔

## خطیب کے خصائص

جن لوگوں نے خطابت کے اصول مدون کیے ہیں، اُن کے نزدیک ایک خطیب کی بنیادی خصوصیتیں یہ ہیں:

۱۔ بے ریا کردار، جس سے خطیب کی شخصیت ترکیب پاتی ہے۔

۲۔ نصب العین، جس سے جماعت میں وحدتِ فکر پیدا ہوتی ہے

۳۔ صداقت شعاری، جس پر سامعین ہمہ تن گوش ہوتے ہیں۔

۴۔ اخلاص، جس سے زورِ بیان نکھرتا ہے۔

۵۔ وجاہتِ ذاتی، جس سے عوام مرعوب ہوتے ہیں۔

۶۔ باخبر ذہن، جس سے مقرر کا اعتماد بڑھتا ہے۔

۷۔ اشارات : جو الفاظ کے سفیر ہو کر ان کی طاقت میں تائیدی اضافہ کرتے ہیں

۸۔ مرتب آواز : جس کا خطابت سے وہی رشتہ ہے جو سورج سے کرنوں کا ہے

۹۔ صحیح تلفظ : جس سے خطابت کی خوب صورتی مہکتی ہے

۱۰۔ محل شناسی : جس سے خطابت کی عظمت بڑھتی ہے۔

۱۱۔ فہم عامہ : جس سے خطابت کی ہڈی مضبوط ہوتی ہے

۱۲۔ مطالعہ : جس کے بغیر خطابت محض ایک آواز ہے۔

۱۳۔ مشاہدہ : ہم اسے خطابت کی بینائی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اور یہ تمام خصوصیتیں شاہ جی میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے خطبا کے ان اوصاف کو مرتب کیا، اُن کی نظریں بے شبہ بڑے بڑے مقرروں کے احوال و وقائع پر تھیں۔

## خطابت کے اجزائے ترکیبی

۱۔ سلاست، جس سے آواز میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ مستعدی، جس کا دوسرا نام برجستہ گوئی اور حاضر جوابی ہے۔

۳۔ مزاح، جس سے طبیعتوں کی تھکاوٹ رفع ہوتی ہے۔

۴۔ تجربہ، جس سے قوتِ بیان مضبوط ہوتی ہے۔

۵۔ تمثیلات، جس سے دلائل کو تقویت پہنچتی ہے۔

۶۔ تکنیک، جس پر خطابت کے مؤثرات کا انحصار ہے۔

۷۔ دعویٰ، جس کے بغیر خطابت میں یقین پیدا نہیں ہوتا

۸۔ اشارات، جنھیں الفاظ و مطالب کی امدادی سپاہ بھی کہا جاتا ہے۔

۹۔ استدلال، جس کے بغیر خطابت الفاظ کا نقار خانہ ہے۔

۱۰۔ اسلوب، خطابت کا پیراہن

۱۱۔ لہجہ، بناؤ سنگھار

۱۲۔ انفرادیت، جو مقرر کو صاحب طرز بناتی ہے۔

ان اجزا کی مثال طبّی نسخہ ایسی ہے کہ ہر جز کا ایک وزن ہوتا ہے اور شاہ جی کی خطابت میں ہر جز جھلکتا ہی نہیں بولتا ہے۔

**شاہ جی کا جادو** —— لیکن بعض خصوصیتیں صرف شاہ جی کے لیے مخصوص ہیں مثلاً وہ مخاطبین کو سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ اس تیزی سے سامعین کو اپنے ساتھ بہا لیے جاتے ہیں کہ ان میں حرکت یا جذبے کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہتی، سب سے بڑی بات عوام سے اُن کی محبّت ہے۔ وہ عوام میں گھلتے ملتے اور انھیں جھنجھوڑتے جگاتے ہیں اُن کے لہجے میں سختی ہے درشتی نہیں، غصّہ ہے انتقام نہیں وہ جانتے ہیں الفاظ کی طاقت ہی اصل طاقت ہے۔ اُنھیں احساس ہے کہ ہر بات جو زبان سے ادا ہو وہ امام شافعیؒ کے الفاظ میں پتھر سے زیادہ سخت، سُوئی سے زیادہ چبھنے والی، ایلوے سے زیادہ کڑوی، چکی کے پاٹ سے زیادہ پھرنے والی اور نوک سناں سے زیادہ تیز ہوتی ہے ان کے ہاں ہر سخن کی ترازو ہے۔ اُن کے الفاظ تُل کر نکلتے ہیں۔ اُن کے ہاں طنز بھی ہے سخت قسم کا طنز لیکن سبّ وشتم نہیں۔ جن چیزوں سے نفور ہوں اُن سے تمسخر بھی روا رکھتے ہیں اُن کے ہاں اس تمسخر یا پھکڑ کی زد سب سے زیادہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اُن کی ذریات پر پڑتی ہے یا پھر وہ رجعت پسند قوتیں جن سے مُلک و قوم کو نقصان پہنچ چکا یا پہنچ رہا ہو۔ چسٹرٹن کے نزدیک طنز یا سٹائر کے معنی ہیں ایک سُور کو اس سے بھی زیادہ مکروہ شکل میں پیش

کرنا جیسا کہ خود خدا نے اُس کو بنایا ہے لیکن ایک دُوسری تعریف یہ ہے کہ بعض طنزیں صحیح ہوتی ہیں بعض محض دل چسپ لیکن سب سے زیادہ موثّر وُہ ہوتی ہیں جو برجستہ ہوں۔ شاہ جی کے ہاں پہلو دار طنزیں مطلق نہیں صرف برجستہ طنزیں ہیں جن سے اُنھوں نے عوام کے منفی جذبات منتشکل کرنے میں خاصی مدد لی ہے۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل

قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

——— چراغ حسن حسرت نے اُن کی تقریر کو غزل سے تشبیہ دی ہے کہ ہر شعر علٰحدہ اور مکمل ہوتا ہے۔ یہ وصف عوامی خطابت کی جان ہے جو بات اسٹیج سے کہی جائے۔ اس میں اعادہ و تکرار ضروری ہیں۔ اس کی مثال اس تصویر کی سی ہے جو مختلف رنگوں اور مختلف خطوں سے تیار ہوتی لیکن مختلف طبیعتوں پر مختلف اثر ڈالتی ہے۔

شاہ جی نے زندگی بھر اتنی تقریریں کی ہیں کہ اب اُن کے لیے تیاری کی ضرورت ہی اضافی ہو گئی ہے حالانکہ تقریر تیاری کے بغیر محض لوپست ہے وُہ جلسہ میں جانے سے گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے تخلیہ میں آرام فرماتے، پھر تازہ دم ہو کر بولتے ہیں۔ اُن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لوگوں کی ہوں سے موضوع یا مضامین چُنتے پھر اُن کی طرفگی کو اس طرح سجاتے ہیں کہ ہر بول میں سامانِ بہار نظر آتا ہے۔

اُنھوں نے تمام زندگی خطابت کے سیکڑوں معرکے سر کیے ہیں۔ وُہ ہمیشہ ایک مُغنّیِ آتش نفس کی طرح رُوح خیال میں اُترتے گئے۔ بسا اوقات اُن کے زورِ بیان سے دھوکا ہوتا ہے کہ ہم اُن کے ساتھ گویا قرنِ اوّل کے مجاہدات کا سفر طے کر رہے ہیں۔ اُن کے موضوع اور مضمون ہمیشہ ہی وسیع رہے ہیں۔ نہ خود تھکے ہیں، نہ دُوسروں کو تھکنے دیتے ہیں۔ اُنھوں نے لوگوں کی

نیندوں کو اپنی سحر بیانی سے خرید کیا ہے۔

ان کی کوئی سی تقریر بھی دو گھنٹے سے کم میں ختم نہیں ہوتی، "جب آتش جوان تھا" تو وہ لگاتار چار چار اور چھ چھ گھنٹے تک لوگوں کو مبہوت کیے رکھتے تھے۔ بیشتر تقریریں رات کے نو بجے سے شروع ہو کر صبح کی اذان تک جاری رہی ہیں۔ امروہہ میں انھوں نے مسلسل تین دن تک تقریر کی۔ اب ایک مدت سے کرسی پر بیٹھ کر تقریر کرتے ہیں ایک دفعہ کسی جلسہ میں شمول کا وعدہ کر چکے تھے۔ سوءِ اتفاق سے اسی روز بیمار ہو گئے، مگر وعدہ پورا کیا۔ چارپائی پر لیٹ کر دو گھنٹے تک بولتے رہے اور لوگ تھے کہ نقش کالحجر بنے بیٹھے تھے۔

**خطابی معرکے**

جن لوگوں نے اُن کی خطابتی معجز نمائیاں دیکھی ہیں انھیں ایسے بے شمار واقعات کا علم ہوگا کہ ہزاروں انسانوں کا جم غفیر آن واحد میں اکائی کی صورت اختیار کر گیا۔ لوگ سنتے اور سر دھنتے رہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ہوا مسموم ہے اور فضا مذموم۔ جتنے بیٹھے ہیں، مخالف بن کے بیٹھے ہیں۔ شاہ جی آئے تو نقد و نظر کی نگاہیں اٹھ گئیں تمام چہروں پر خندہ استہزا پھیل گیا۔ بعض لوگ مجسم طعن و تشنیع ہو گئے، کتنوں نے ٹھٹھا کیا۔ ہجوم کے ہونٹوں پر قہقہے ابھر کر رک گئے لیکن ادھر شاہ جی نے خطبۂ مسنونہ پڑھا اور گونج دار آواز میں فرمایا:

صدرِ محترم اور تماشائی بھائیو! تو اس پر کچھ تنقیدی چہروں سے ہلکی سے مسکراہٹ جھلکنے لگی، مزید فرمایا مجھے بیس سال لاہور آتے ہوئے ہو گئے، میں بڈھا ہو گیا لیکن مجھے ہنوز یہ پتہ نہیں چلا کہ آپ ہیں کیا؟ غوث ہیں، قطب ہیں، ابدال ہیں، غرض کچھ سمجھ میں نہیں آتا، آپ کو کس خطاب سے یاد کروں ——————— (قہقہہ)

اور اب قرآن کی آیتیں اُردو فارسی کے شعر، انمول فقرے، دلچسپ تمثیلات، خوشگوار

لطائف، کھلتے اور بکھرتے چلے جا رہے ہیں۔ آواز میں لوچ، گلے میں رس، چہرے پر طنطنہ، مضمون پر اعتماد، پھول ہیں کہ جھڑتے جاتے ہیں۔ لوگ ہنستے ہیں، لوگ روتے ہیں ابھی قہقہہ ابھی آنسو!

—— چاروں طرف تاریک سناٹا ہے۔ نصف رات گزر چکی، نصف باقی ہے۔ بمبئی کے ایک کھلے میدان میں جلسۂ عام ہے۔ سمندر کی لہریں ٹھہری نظر آتی ہیں۔ شاہ جی نے قرآن پڑھنا شروع کیا، پڑھتے گئے۔ پندرہ منٹ قرآن، پانچ منٹ ترجمہ، دس منٹ تفسیر — پھر شعر — پھر قرآن — رات کمر کھولتی ہے۔ شاہ جی مضمون باندھتے ہیں جب صبح ہو چکی تو ہندو ویشیاں بھی داد دے اُٹھیں: "شاہ جی تو رشیوں کی زبان بولتے ہیں"۔

ہمارے کئی ہندو دوست شاہ جی کی تقریر صرف اس لیے سننے چلے آتے تھے کہ انہیں شاہ جی کا قرآن پڑھنا اچھا لگتا تھا۔

—— ۱۹۴۶ء میں یو پی احرار کانفرنس کا اجلاس بجنور میں ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے اجلاسِ شبینہ میں قرآن پڑھنا شروع کیا تو ایک گھنٹہ تک قرآن ہی پڑھتے چلے گئے۔ مجال ہے کہ ایک آدمی بھی مجمع سے ہلا ہو۔ تمام لوگ ہاتھ کی لکیروں کی طرح جمے بیٹھے تھے۔ اِدھر وہ قرآن سنا رہے تھے۔ اُدھر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ قرآن نازل ہو رہا ہے اور صفا و مروہ کی پہاڑیوں میں گونجی ہوئی سورتیں بجنور کے اُفق سے اُتر رہی ہیں ——!

—— "انجمن خدام الدین" کا سالانہ اجلاس مارچ ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوا۔ وہاں آپ نے اس زناٹے کی تقریر کی کہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر آپ کو "امیر شریعت" منتخب کر لیا گیا۔ پانچ سو علماء نے بیعت کی، جن میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور بھی شامل تھے۔

——— سائمن کمیشن کی آمد پر تمام مُلک میں تاریخی مظاہرے کیے گئے۔ الہ آباد میں سائمن کمیشن کی ارتھی نکال کر اُسے گنگا و جمنا کے سنگم پر جلایا گیا۔ پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک عظیم الشّان جلسہ منعقد ہُوا جس میں بڑے بڑے مقرروں نے دادِ سخن حاصل کی۔ شاہ جی سب سے آخر میں بولنے اُٹھے تو بولنے کے لیے بظاہر کوئی نکتہ باقی نہ رہا تھا لیکن غالبؔ کے اس شعر کو اس کیف سے پڑھا کہ خود پنڈت موتی لال نہرو جھُوم جھوم گئے ———

ہُوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہُوئے کیوں نہ غرق دریا

نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ ایک مصرعِ طرح تھا، جس پر یک غزلہ، دو غزلہ اور سہ غزلہ ہو گیا۔ پنڈت جی کہا کرتے تھے:

"شاہ صاحب! آپ تو ہندوستان کے دل کی آواز ہیں"

——— لاہور میں سائمن کمیشن کا جو استقبال ہُوا، اسی کا نتیجہ تھا کہ لالہ لاجپت رائے لاٹھیاں کھا کر سورگباش ہو گئے۔ لالہ جی نے مظاہرے کی رات موری دروازہ کے باہر جو تاریخی تقریر کی، اُس کے الفاظ آج تک گونجتے ہیں لیکن شاہ جی نے جو رنگ باندھا، وُہ سب سے نرالا تھا۔ ایک بہت بڑے پولیس آفیسر نے اپنی یادداشتوں میں لکھا تھا کہ اُس رات گویا انگریزی حکومت کے لیے لاہور میں کوئی جگہ باقی نہ رہی تھی لیکن ساری تقریر میں ایک حرف بھی قابلِ مواخذہ نہ تھا۔

——— ۱۹۲۷ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے مہاشہ راج پال ناشر "رنگیلا رسول" کو قانون کے اصطلاحی سُقم پر رہا کر دیا تو مُسلمانوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ انھوں نے جلسۂ عام کرنا چاہا مگر لاہور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوی نے دفعہ ۱۴۴ لگا دی

شاہ جی نے شاہ محمد غوثؒ کے بالمقابل احاطۂ عبدالرحیم میں جلسہ کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ مولانا مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعید دہلوی بھی اس فقید المثال جلسہ میں موجود تھے۔ اِدھر احاطے کے دروازے پر پولیس کے مسلح دستوں کا پہرہ تھا۔ شاہ جی نے تقریر شروع کی:

"آج آپ لوگ جناب فخرِ رُسل محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلّم کے عزّ و ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آج جنسِ انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرے میں ہے۔ آج اس جلیل المرتبت ہستی کا ناموس معرضِ خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔

آج مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کے دروازے پر اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ آئیں اور فرمایا: ہم تمھاری مائیں ہیں، کیا تمھیں معلوم نہیں؟ کہ کفّار نے ہمیں گالیاں دی ہیں —— ارے دیکھو! اُمّ المومنین عائشہ دروازے پر تو کھڑی نہیں؟ (یہ جملہ اس جلال و غضب میں ادا کیا کہ حاضرین کی نگاہیں بے ساختہ دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایکا ایکی کہرام مچ گیا، مسلمان دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔)

—— تمھاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو لیکن کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آج گنبدِ خضریٰ میں رسول اللہؐ تڑپ رہے ہیں۔ آج خدیجہؓ و عائشہؓ پریشان ہیں۔ بتاؤ تمھارے دلوں میں اُمّہات المومنینؓ کی کوئی جگہ ہے؟ آج امّ المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں، وہی عائشہ جنھیں رسول اللہؐ حُمیرا کہہ کر پکارا کرتے تھے جنھوں نے سیدِ عالمؐ

کو وصال کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ اگر تم خدیجہؓ و عائشہؓ کے ناموس کی خاطر جانیں دے دو تو یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہو گی"۔

آخر راج پال قتل ہو گیا، جس ناموس کی حفاظت سے قانون قاصر تھا، اس کی حفاظت ایک مسلمان نے جان لے کر اور جان دے کر کی۔ برطانوی ہندوستان میں یہ امر تسلیم شدہ حقیقت ہو گیا کہ مسلمان حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کی حفاظت قانون ہی سے نہیں خون سے بھی کرتا ہے۔

—— قادیان کی تبلیغ کانفرنس (۱۹۳۴ء) میں آپ نے جو تقریر کی اس کی مقناطیسی کشش کا اعتراف مسٹر جی ڈی کھوسلہ نے اپنے فیصلے میں کیا ہے۔ اس ٹکڑے ہی سے جذبات کی معراج معلوم ہوتی ہے:

"وہ (مرزا محمود) نبی کا بیٹا ہے، میں نبیؐ کا نواسہ ہوں۔ وہ آئے اور مجھ سے اردو پنجابی فارسی میں ہر معاملہ سے متعلق بحث کر لے یہ جھگڑا آج ہی طے ہو جاتا ہے۔ وہ پردے سے باہر نکلے، نقاب اٹھائے، کشتی لڑے، مولا علی کے جوہر دیکھے۔ ہر رنگ میں آئے۔ وہ موٹر میں بیٹھ کر آئے، میں ننگے پاؤں آؤں۔ وہ حریر و پرنیاں پہن کر آئے میں موٹا جھوٹا پہن کر آؤں۔ وہ مزعفر کباب یاقوتیاں اور اپنے ابا کی سنت کے مطابق پلومر کی ٹانک وائن پی کر آئے میں نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کے آؤں"۔ ہمیں میدان ہمیں گو"

غرض اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں جن سے شاہ جی کی خطیبانہ عظمت کا سراغ ملتا ہے پھر اس کی سب سے بڑی شہادت تحریکِ ختمِ نبوت کا وہ بانکپن ہے جس کے نشہ میں لوگوں نے جانیں نچھاور کی تھیں۔ آج بھی جب ان کی عمر میں ستاسٹھویں سال کی گرہ لگ چکی ہے اپنے ہمراہ

وہ سرفروشوں کی ایک ایسی جماعت رکھتے ہیں جو عددی اعتبار سے قلیل سہی لیکن سرفروشی کے اعتبار سے پاکستان میں کوئی خطیب بھی اتنے فداکار پیدا نہیں کر سکا ——

کالی داس نے عورت کے رُوپ کی تصویر کھینچتے ہُوئے کائنات کی جن تصوری اور نظری خوب صورتیوں کو یک جا کیا ہے، اُن تمام خوبصورتیوں کا مُرقّع شاہ جی کی خطابت ہے۔ رعد کی گرج، بادل کی گرج، ہوا کا فرّاٹا، فضا کا سنّاٹا، صُبح کا اُجالا، چاندنی کا اُجالا، ریشم کی جھلملاہٹ، ہوا کی سرسراہٹ، گلاب کی مہک، سبزے کی لہک، آبشار کا بہاؤ، شاخوں کا جُھکاؤ، طوفان کی کڑک، سمندروں کا خروش، پہاڑوں کی سنجیدگی، صبا کی چال، اوس کا نم، چنبیلی کا پیراہن، تلوار کا لہجہ، بانسری کی دُھن، عشق کا بانکپن، حُسن کا اغماض اور کہکشاں کی مسجع و مقفّع عبارتیں انسانی آواز میں ڈھلتے ہی خطابت کی جو صُورت اختیار کرتی ہیں، اس کا جیتا جاگتا مُرقّع شاہ جی کی ذات ہے۔

شاہ جی نے چالیس برس تک بیسیوں قومی تحریکوں کو جگمگایا ہے۔ انھیں عامۃ الناس کے مزاج و طبیعت سے کماحقہٗ آگاہی ہے۔ اُن کے ہاں خشونت بھی ہے اور عطوفت بھی، خوش ہوں تو لوگوں کو متاعِ عزیز گردانتے، ناخوش ہوں تو قبریں کُرید کُرید کر پکارتے ہیں۔ اُنھیں ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ اُنھوں نے بنجر زمینوں میں ہل جوتے اور صحراؤں میں سفر کیا ہے نطشے کے الفاظ: "میں انسان کے پاس گیا تو ہوں لیکن انسان تک پہنچا نہیں" —— ع

مرا شُد حاصلے کشتِ خرابے

شاہ جی عُمر کی جس منزل میں ہیں، اُس میں انسان صرف ماضی کی داستاں سرائی کے لیے رہ جاتا ہے اور شاہ جی تو ہیں ہی ماضیٔ مرحوم کی صدائے بازگشت۔ اُنھیں اقبال کی طرح جو ہے اُس پر جھنجھلاہٹ ہے، جو تھا اُس سے لگاؤ ہے اور جو ہوگا اُس کا انتظار ہے، لیکن

اپنے مزرعِ ویراں سے اُنھیں سخت مایوسی ہے' وُہ اقبال کی طرح یہ نہیں کہتے کہ — ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی

اُن کا نقطۂ نگاہ جس کا بظاہر کوئی عنوان نہیں' دُوسرا ہے۔ غالباً وُہ کہنا چاہتے ہیں:

"ہم نے اس زمین کو بہت سا نم دیا ہے۔ پھر میرا نم ہی کیا؟ اسے تو زہراؓ نے آنسُو اور حُسینؓ نے خُون دیا تھا۔ دجلہ و فرات کے گیسُو اُسی طرح تاب دار ہیں۔ حُسینؓ کا قافلہ تیرہ سو برس سے لُٹ رہا ہے

کائنات کو چلنے دو۔ سُورج نکلتا اور ڈوبتا ہے۔ ہم مرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ہمارے سپرد جو فرض تھا، الحمدللہ اس سے عُہدہ برآ ہونے میں دل و دماغ نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔"

"ہم ہر منزل میں ٹھہرے مگر رُکے نہیں' ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں' طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ پیش آئے مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی۔ دُنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔"

(ابُوالکلام)

اور اب شاہ جی وہاں ہیں جہاں نہ تو شکستوں کے ماتم کا حوصلہ باقی رہ جاتا ہے اور نہ اُمیدوں کے چراغ جلانے کا شوق۔ تمام زندگی کا نچوڑ میر دردؔ کے اس ایک شعر میں سمٹ کر آگیا ہے:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

---

# ہندوستان میں ابنِ تیمیہؒ

## مولانا ابوالکلام آزاد

(ایک تاریخی مطالعہ)

---

شورش کاشمیری ——— پندرہ برس سے تاریخ کے اس مجلا عنوان کی حکایتیں جمع کر رہا ہے اُس نے ابوالکلام کو تفسیر و تاریخ، ادب و سیاست اور انشا و خطابت کے میدانوں میں "تن تنہا" پایا ہے۔

"ہندوستان میں ابن تیمیہؒ" ——— ابوالکلام کا عکس ہے!

——— جب کوئی سیاح ہندوستان جاتا ہے تو وہ تاج محل کی رعنائی، لال قلعہ کے بانکپن، اجنتا کے غاروں، اجودھیا کے کھنڈروں، بنارس کی صبح، اودھ کی شام، بدھ کے مجسموں اور دلی کے آثار میں گم شدہ ماضی کی مرحوم کہانیاں ڈھونڈتا ہے وہ چاہتا ہے، اُس سے گنگا کوئی قصہ کہے، جمنا کوئی راگ چھیڑے اور برہم پترا ہم کلام ہو ——— طلوع تاریخ سے پہلے کی باتیں ——— لیکن شورش کاشمیری کے مطالعہ و مشاہدہ کا محور (بتکدوں میں اذان کی صدا) ——— ابوالکلام ہیں۔

اور شورش کاشمیری پندرہ برس سے یہ کہانی لکھ رہا ہے۔

——— (زیرِ قلم) ———

○

—— شورش کاشمیری کے قلم سے !!

# ظفر علی خان

(مولانا کے افکار و سوانح کا تذکرہ)

○

○ —— جب پنجاب بلاشبہ سیاسی قبرستان تھا

○ —— سندھ میں قومی زندگی کے ستون ریت کی دیواریں تھیں

○ —— سرحد کے میدانوں میں پتھروں کا انجماد تھا

○ —— اور دہلی مرحوم —— تاریخ کے رخسار پر ایک پایاب آنسو

○ —— تب ظفر علی خان نے سیاست میں للکار، صحافت میں احتجاج، شاعری میں رجز اور انشا میں گونج پیدا کی۔

شورش کاشمیری نے اسی للکار، احتجاج، رجز اور گونج کی سرگزشت لکھی ہے

ادبی معرکوں اور سیاسی ہنگاموں کی دستاویز۔

—— قیمت چار روپے ——

کاتب: سید نور حسین افضل رقم

○

دفترِ "کتابت" لاہور

## مولانا ابوالکلام آزاد کی کہانی
## خود مولانا کی زبانی

——— ایک بچہ کیونکر محی الدین سے ابوالکلام بنا، پھر امام الہند ہو گی
حتیٰ کہ ایک خاص دور کی جبینیں اسکے قلم و علم کی محراب میں جھک گئی
ایک با وقار کہانی جسے جیل خانے کی تنہائیوں میں مولانا نے اپنے ہم قل
رفیق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو املا کرایا

( باتصویر )

قیمت خاص ایڈیشن
پانچ روپے

قیمت عام ایڈیشن
تین روپے ۸ آنے